www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

September-October 2023 • Rs. 40

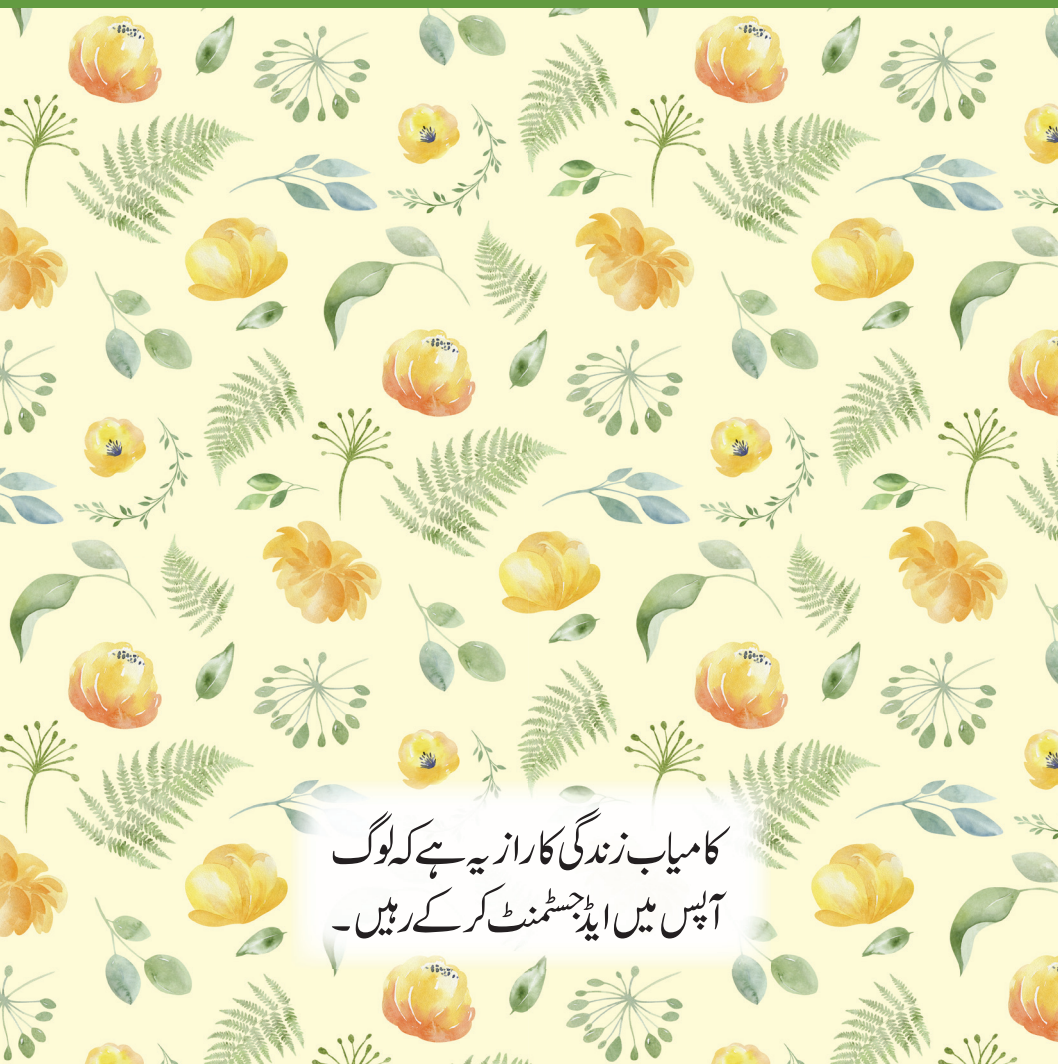

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Sep-Oct 2023 | Volume 48 | Issue 5

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹40 per copy
Subscription by Book Post	₹200 per year
Subscription by Regd. Post	₹400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Al-Risala Monthly
Punjab National Bank
A/c No. 0160002100010384
IFSC Code: PUNB0016000

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

عظیم معافی	4
اسم اعظم کی دعا	5
بعد حین	6
عقل کی اہمیت	7
بااصول انسان	8
بے ہمتی نہیں	9
آرٹ آف ڈفرینس مینجمنٹ	10
عظیم خوش خبری	11
تکرار	13
مطالعۂ حدیث (شرح مشکاۃ المصابیح)	14
ڈائری 1986	24
انفارمل ایجوکیشن	41
کیسا عجیب اسلام	42
بے خبری کا مسئلہ	43
گرین لینڈ، ایک وارننگ	45
استطاعت کا اصول	47
خبر نامہ اسلامی مرکز-280	49
اعلان	50

भविष्यवाणी योग्य चरित्र	1
एक आज़माइश	2
एक आयत	4
मानवीय गुण	6
अनोखी विशेषता	8
क़ुरआन और साइंस	9
पैग़म्बर का तरीक़ा	13
अल्लाह की मदद	14
कम पर राज़ी होना	15

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

عظیم معافی

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللهِ إِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (39:53)۔ یعنی کہو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ قرآن کی سب سے زیادہ پرامید آیت ہے (الاتقان للسیوطی، جلد 6، صفحہ 2161)۔ علی بن ابی طالب کا قول ہے: مَا فِي الْقُرْآن أوسع آيَة من هذه (تفسیر الدر المنثور، جلد 7، صفحہ 238)۔ یعنی قرآن میں اس سے زیادہ وسعت والی آیت نہیں۔ عبداللہ بن مسعود کا قول ہے: أَكْبَرُ آيَةٍ فِي الْقُرْآنِ فَرَجًا (مصنف عبدالرزاق، اثر نمبر 6002)۔ یعنی قرآن میں سب سے کشادگی والی آیت۔

قرآن کی یہ آیت مجھ کو بے حد عجیب معلوم ہوتی ہے۔ انسان کے تمام گناہوں کو بخش دینا بلاشبہ اللہ کی اتنی بڑی عنایت ہے کہ اس سے بڑی کوئی عنایت نہیں ہوسکتی۔ میں اس آیت پر سوچ رہا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ شاید ایسا ہوا کہ اللہ کی رحمت نے چاہا کہ وہ اس انسان کو اپنی سب سے بڑی عنایت دے، جس کو اس نے، قرآن کے مطابق، اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے (38:75)۔ مگر اللہ نے دیکھا کہ انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں، جس کو وہ اس عظیم عنایت کا ریزن بنائے۔ تو اللہ نے یہ کیا کہ اس کو یک طرفہ طور پر اپنی رحمت کے خانے میں ڈال دیا، اور کہا کہ میں اپنی رحمت سے انسان کے لیے اس بڑی عنایت کا اعلان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ”بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے“۔

انسان اپنے کسی عمل کی بنیاد پر اتنی بڑی عنایت کا مستحق نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کے تمام گناہ بخش دیے جائیں۔ تو گویا اللہ نے کہا کہ میں انسان کے لیے اپنی خصوصی رحمت اور خصوصی فضل کا اعلان کرتا ہوں، یعنی میں انسان کے تمام گناہوں کو بخش دوں گا۔ اس اعلانِ عام کے ذریعہ اللہ تعالی یہ کہہ رہا ہے کہ اے انسان! تو نے خواہ کوئی بھی غلطی کی ہو، تو میرے پاس مغفرت کا طالب بن کر آجا، میں اپنی رحمتِ خاص سے تیرے سب گناہوں کو بخش دوں گا۔ اور میں بخشش کو تجھے بطور تحفہ دے دوں گا۔

اسم اعظم کی دعا

حدیث کی کتابوں میں اسم اعظم کے ذریعے کی جانے والی دعا کا بہت بڑا درجہ بتایا گیا ہے۔ اس کے متعلق رسولِ خدا نے یہ خبر دی ہے کہ وہ ضرور مقبول ہوتی ہے (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3544)۔ احادیث میں مذکور اسم اعظم سے مراد معروف معنوں میں ''اسم'' نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہی چیز ہے، جس کو پوائنٹ آف ریفرنس کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک بندہ دعا کرتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ خدایا! تو نے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے (ص، 38:75)۔ اب کیا تیری رحمت کا تقاضا ہوگا کہ تو مجھے آگ میں ڈال دے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ خدایا! میرے گناہوں کو معاف فرما۔ خدایا! میں تیری رحمت کے حوالے سے یہ دعا کرتا ہوں کہ فیصلے کے دن تو مجھ کو جنت میں داخل فرما۔

اسم اعظم کے ساتھ دعا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسے حوالے کے ساتھ دعا کرنا، جو اللہ کی رحمت کو انووک (invoke) کرنے والا ہو۔ ایسی دعا، جس میں بندہ اپنی غلطی کا آخری حد تک اعتراف کرے، اسی کے ساتھ اللہ کی رحمت کا آخری حد تک طلب گار بن جائے۔ ایسی دعا جو اپنے کسی عمل کے واسطہ کو ذریعہ بنا کر اللہ سے دعا نہ کی گئی ہو، بلکہ اللہ کی رحمت بے پایاں کو واسطہ بنا کر اپنے جائز مدعا کو پیش کیا گیا ہو۔

اسم اعظم کی دعا وہ ہے، جو اللہ رب العالمین کی صفت کو حوالہ بنا کر دعا کی گئی ہو۔ ایسی دعا کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پورے معنوں میں عاجز بن جائے۔ جو اللہ کی کمال قدرت کے مقابلے میں اپنے کامل عجز کا نمونہ ہو۔ اس قسم کی دعا بلاشبہ اسم اعظم کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس اسمِ اعظم کے حوالے سے دعا کرنے کی توفیق پائیں۔ اسم اعظم کے ساتھ دعا کرنے کے مطلب ہے اللہ رب العالمین کی صفت اعظم کے ساتھ طالب دعا ہونا۔ جب آدمی اللہ رب العالمین کی کسی صفت کو شعوری طور پر دریافت کرے، اور اس کے حوالے سے اللہ سے اس کی رحمت کا طالب بنے تو ایسی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔

بعد حین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: ثَلَاثٌ لَا تُرَدُّ دَعْوَتُهُمْ، الإِمَامُ العَادِلُ، وَالصَّائِمُ حِينَ يُفْطِرُ، وَدَعْوَةُ المَظْلُومِ يَرْفَعُهَا فَوْقَ الغَمَامِ، وَتُفَتَّحُ لَهَا أَبْوَابُ السَّمَاءِ، وَيَقُولُ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ: وَعِزَّتِي لَأَنْصُرَنَّكِ وَلَوْ بَعْدَ حِينٍ (جامع الترمذی، حدیث نمبر 2526)۔ یعنی تین لوگوں کی دعا رد نہیں کی جاتی۔ عادل امام، روزہ دار جب کہ وہ افطار کرے، اور مظلوم کی دعا۔ وہ اس کو بادلوں کے اوپر اٹھاتا ہے، اور اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری عزت کی قسم! میں ضرور تمہاری مدد کروں گا اگرچہ کچھ عرصے کے بعد کروں۔

اس حدیث رسول سے دعا کی قبولیت کا اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ دعا خواہ بالکل درست ہو، مگر اس کی قبولیت میں ہمیشہ وقت لگتا ہے۔ کسی فرد کی دعا جب قبول کی جاتی ہے، تو وہ صرف ایک دعا کا معاملہ نہیں ہوتا ہے۔ اللہ رب العالمین پورے عالم کو مینج (manage) کر رہا ہے۔ کوئی ایک دعا جب بھی قبول کی جاتی ہے تو وہ اس وقت اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے جب کہ تمام متعلق تقاضے پورے ہو چکے ہوں۔

مثلاً اللہ رب العالمین کا یہ فیصلہ تھا کہ مکہ میں رسول اللہ بعثت کے بارے میں پیغمبر ابراہیم کی دعا قبول کی جائے (البقرۃ، 2:129)۔ لیکن اس دعا کی قبولیت میں وقت لگا۔ پیغمبر اسلام کا ظہور عملاً دعا کے تقریباً ڈھائی ہزار سال بعد پیش آیا۔ کیوں کہ یہ ضروری تھا کہ اس سے پہلے تمام متعلق تقاضے پورے ہو چکے ہوں۔ تاریخ کے بڑے بڑے واقعات ہمیشہ اسی طرح لمبی مدت کے بعد ظہور میں آتے ہیں۔ بڑی بڑی دعاؤں کے لیے پوری انسانی تاریخ کو مینج کرنا پڑتا ہے۔

ایسی حالت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی خوب دعائیں کرے، لیکن دعا کی قبولیت کے معاملے کو وہ اللہ کے حوالے کر دے۔ اگر بظاہر کسی آدمی کی دعا کی قبولیت میں دیری ہو رہی ہے تو اس کو یقین کرنا چاہیے کہ اللہ اس کے لیے کچھ بہتر کرنا چاہتا ہے۔ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کسی بندے کے لیے خیر کیا ہے (البقرۃ 2:216)۔ انسان صرف اپنی خواہشوں کو جانتا ہے، نہ یہ کہ اس کے لیے خیر کس چیز میں ہے۔

عقل کی اہمیت

وہب بن منبہ (114-34 ہجری) مشہور تابعی ہیں۔ ان کا شمار اسلام کے ابتدائی مورخین اور قدیم آسمانی کتابوں کے عالموں میں ہوتا ہے۔ ان کا ایک قول ان الفاظ میں آیا ہے: مَا عُبِدَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ بِشَيْءٍ أَفْضَلَ مِنَ الْعَقْلِ (العقل وفضلہ لابن ابی الدنیا، اثر نمبر 21)۔ یعنی اللہ کی عبادت کا سب سے بہتر ذریعہ عقل ہے۔ یہاں عقل سے مراد شعور ہے۔ یعنی سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ انسان کو سچائی کی شعوری دریافت ہو، اور وہ شعور کی سطح پر اللہ کی عبادت کرے۔

ایک عبادت وہ ہے کہ آدمی ایک فارم کا اپنے آپ کو عادی بنالے، اور اس فارم کو دہرا کر اللہ کی عبادت کرے۔ یہ فارم کی سطح پر اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ مبنی بر فارم عبادت بھی عبادت کا ایک درجہ ہے۔ لیکن زیادہ بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی قرآن اور سنت کی تعلیمات پر غور کرے۔ وہ شعور کی سطح پر اللہ رب العالمین کو دریافت کرے۔ پھر شعوری دریافت کی سطح پر اللہ کے وجود پر یقین کرے، اور اس کا عبادت گزار بن جائے۔

جب آدمی فارم کی سطح پر عبادت کرتا ہے، تو وہ ایک ایسی عبادت ہوتی ہے، جو اس کے شعور کو نہیں چھوتی۔ اس کا شعور الگ ہوتا ہے، اور اس کی عبادت الگ۔ مگر جو عبادت دریافت کی سطح پر ادا کی جائے، وہ انسان کے پورے وجود کا اظہار بن جاتی ہے۔ فارم کی عبادت میں عبادت الگ ہوتی ہے، اور انسان کی شخصیت الگ۔ لیکن جو عبادت شعوری دریافت کے تحت کی جائے، وہ عبادت فرشتوں کے درجے کی عبادت ہوتی ہے۔ ایسی عبادت میں انسان کا احساس انسان کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔ انسان بظاہر اعضا و جوارح (body organs) کا مجموعہ ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ انسان کی شخصیت شعوری دریافت کے نتیجہ میں بنتی ہے۔ ایسی عبادت میں انسان کی ہستی اور اس کا شعور دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ عبادت ہے، جب کہ انسان خدا کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جس کے لیے قرآن میں واسجد واقترب کے الفاظ آئے ہیں (96:19)۔ یعنی، سجدہ کر اور خدا سے قریب ہو جا۔

بااصول انسان

زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی فطرت کے قانون کو سمجھے، اور اس کی پیروی کرتا ہوا زندگی گزارے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کسی اصول کا پابند نہ ہو، جو اس کے جی میں آئے، اس کو وہ کرے۔ اس کو نہ جھوٹ اور سچ کی تمیز ہو، اور نہ وہ صحیح اور غلط میں فرق کرے۔

یہ دونوں روش اپنے انجام کے اعتبار سے یکساں نہیں ہے۔ جو آدمی اصول کا پابند ہو، وہ اصول کے مطابق زندگی گزارے، وہ اللہ کے یہاں کامیاب انسان قرار پائے گا۔ اس حقیقت کو قرآن میں اہل جنت کے حوالے سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى (79:40)۔ یعنی اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا۔ اس کے لیے اللہ کے یہاں جنت ہے۔ اس کے برعکس، جو انسان صحیح اور غلط میں تمیز نہیں کرے۔ وہ صرف اپنی خواہش کو جانے، اور اس کی پیروی میں زندگی گزارے، ایسا آدمی اللہ کی نظر میں ناکام انسان ہے۔ اللہ کے یہاں اس کی پکڑ ہوگی (79:37-39)۔

بااصول انسان ہونا کیا ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کرکے اس دنیا میں رکھا، اور اس کو کامل آزادی دی۔ یہ کامل آزادی ایک انتہائی انوکھا اختیار ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ کامل آزادی کے باوجود اپنی آزادی کو ڈسپلن کے اندر استعمال کرے۔ یعنی کسی جبر کے بغیر خود اپنے اختیار سے وہی کرنا، جو خدا انسان سے کروانا چاہتا ہے۔ انسان کو اپنے اختیار سے وہی کرنا ہے، جو دوسری مخلوق جبلی فطرت (instinct) کی بنا پر کر رہی ہے۔ اس کو خود اختیار کردہ اخلاقیات (self-imposed ethics) کہا جاسکتا ہے۔

قرآن (67:2) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا تاکہ وہ دیکھے کہ کون لوگ احسن العمل (best in conduct) ہیں۔ احسن العمل کا مطلب ہے بااصول زندگی گزارنے والے افراد۔ مثلاً وہ آدمی جو غصہ دلائے جانے کے باوجود غصہ کو قابو میں رکھے، وغیرہ۔

بے ہمتی نہیں

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (3:139)۔ یعنی اور ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو، تم ہی کامیاب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ 'وھن' کے معنی ضُعف کے ہیں۔ خواہ یہ ضعف عمل کا ہو یا ارادے کا۔ یہ آیت جنگ وقتال کے بارے میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ زندگی کی جدو جہد کے بارے میں ہے۔ اس جدو جہد کے لیے مومنانہ اصول کیا ہیں۔ اس کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خالق کی اس دنیا میں ہمیشہ عسر کے ساتھ یسر موجود رہتا ہے۔ یعنی مسئلے کے ساتھ اس کا حل۔ زندگی کی جدو جہد میں ہمیشہ ایسے لمحات پیش آتے ہیں، جو مومن کو وقتی طور پر بے ہمت کرنے والے ہوں، لیکن مومن کا اعتماد اللہ رب العالمین کی نصرت پر ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں یہ امید رکھتا ہے کہ اگر وہ سچائی کے راستے پر ہے تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا، اور اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچائے گا۔ بندے کی طرف سے جدو جہد کے مرحلے میں یہ شرط ہے کہ وہ ہمت نہ ہارے۔

''اگر تم مومن ہو'' امطلب یہ ہے کہ مومن کو اپنی طرف سے یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ اللہ پر بھروسہ کرنے والا ہے۔ وہ اللہ پر ہر حال میں یقین رکھے ہوئے ہے۔ اللہ کی مدد پر یہ یقین اللہ کی رحمت کو انوک (invoke) کر دیتا ہے۔ وہ اللہ کی مدد کو یقینی بناتا ہے۔

ایک مومن بندہ کا طریقہ کیا ہونا چاہیے، اس سلسلے میں ایک رہنما حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ، صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2999)۔ یعنی، مومن کا معاملہ عجیب ہے۔ بیشک اس کے تمام معاملے میں خیر ہے۔ اور یہ کسی اور کے لیے نہیں ہے، سوائے مومن کے۔ اگر اس کو خوشی پہنچی تو اس نے شکر کیا، یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور اگر اس کو مصیبت پہنچی تو اس نے صبر کیا۔ یہ اس کے لیے بہتر ہے۔

آرٹ آف ڈفرینس مینجمنٹ

طلاق کے بارے میں ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى الطَّلَاقُ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 2178)۔ یعنی اللہ کے نزدیک حلال میں سب سے ناپسندیدہ عمل طلاق ہے۔ طلاق ایک البغض (سب سے ناپسندیدہ) عمل کیوں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نکاح کا طریقہ اس لیے رکھا گیا تھا کہ انسان نکاح کے ذریعے اپنی تربیت کا کورس مکمل کرے۔ وہ کورس یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے بارے میں خالق کا نقشۂ تخلیق یہ ہے کہ آدمی اس راز کو جانے کہ اختلاف کو مینج کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ زندگی میں لازمی طور پر اختلافات پیش آتے ہیں۔ یہ اختلافات اس لیے نہیں ہیں کہ آدمی لڑنا بھڑنا شروع کردے۔ بلکہ اس لیے ہیں کہ آدمی پرامن انداز میں ان کو مینج (manage) کرے۔

یہ اختلافات کسی کی سازش کی وجہ سے نہیں ہیں، بلکہ وہ نظامِ فطرت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ان اختلافات کے بارے میں یہ مطلوب نہیں ہے کہ آدمی ان سے لڑنا شروع کردے یا ان کو برائی (evil) سمجھ کر شادی کے بارے میں منفی رائے قائم کرلے۔ بلکہ آدمی کی ساری پلاننگ اس بنیاد پر ہونا چاہیے کہ جو شادی ہوگئی، اس کے ساتھ اس کو نباہ کرنا ہے۔ کوئی دوسرا آپشن اس کے لیے ممکن نہیں۔

شادی کا مقصد زندگی کی خوشی حاصل کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ زندگی کو سمجھ کر انسان مثبت انداز میں اس کی تعمیر کرے۔ ایسی تعمیر جو پوری انسانیت کے لیے مفید ہو۔ شادی دو انسانوں کے درمیان اجتماع کا نام نہیں ہے، بلکہ شادی ایک سماجی ذمے داری ہے۔ شادی سماج کے عمومی عمل کا ایک حصہ ہے۔ شادی مستقبل کی منصوبہ بندی ہے، نہ کہ وقتی طور پر خوشیوں کی ایک دنیا بنانا۔ خوشیوں کی دنیا بنانے کا نظریہ ایک ایسا نظریہ ہے، جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے:

Prima facie it stands rejected.

چنانچہ دنیا میں کوئی شادی اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ ہر شادی اس معیار پر قابلِ رد قرار پاتی ہے۔

عظیم خوش خبری

یوسف بن یعقوب ایک اسرائیلی پیغمبر ہیں۔ ان کی زندگی کی کہانی کو قرآن کی سورہ یوسف میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس کو قرآن میں احسن القصص (12:3) کا ٹائٹل دیا گیا ہے، یعنی ایک بہترین سرگزشت (best story)۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ حضرت یوسف کی کہانی انسان کے لیے بہترین سبق والی کہانی ہے۔ اس کہانی کے سبق آموز پہلو کو راقم الحروف نے اپنی تفسیر تذکیر القرآن میں کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔

سورہ یوسف کے آخر میں اس احسن القصص کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَشَاءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ (12:110)۔ یعنی یہاں تک کہ جب رسول مایوس ہو گئے اور وہ خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کو ہماری مدد آپہنچی۔ پس نجات ملی جس کو ہم نے چاہا اور مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب ٹالا نہیں جا سکتا۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ حد آجائے کہ بندے پر انتظار کی گھڑیاں شاق گزریں تو بلا تاخیر اللہ کی نصرت آجاتی ہے۔ اللہ رب العالمین کی طرف سے یہ عظیم خوش خبری صرف پیغمبروں کے لیے نہیں ہے، صرف پیغمبر کے ساتھیوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے، جو قرآن کی اس سورہ کا مطالعہ کریں، اور اس میں جو سبق (takeaway) ہے، اس کو دریافت کر کے اپنی زندگی میں اپنائیں۔ غالباً اس پیغمبرانہ قصے کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ اللہ کی رحمت اور نصرت اس کے سچے طالب کے اوپر ضرور آتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ سچے طالب کی طرف نہ آئے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ طالب کو چاہیے کہ وہ پورے یقین اور صبر کے ساتھ خدا کی نصرت کا انتظار کرے، وہ کسی بھی حال میں مایوسی کا شکار نہ ہو، وہ ہر حال میں اللہ رب العالمین کی رحمت کا امیدوار بنا رہے۔ اللہ نے آغازِ تخلیق میں یہ اعلان کر دیا تھا: إِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي (صحیح البخاری،

حدیث نمبر 3194)۔یعنی بیشک میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے۔

اللہ کی نصرت کا یہ قانون کیوں ہے کہ بندے کی دعا اس وقت قبول ہوتی ہے، جب کہ بندے کے اوپر مایوسی کی آخری حد آجائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی رحمت تو یقینی طور پر بندے کے لیے اللہ کا عطا کیا ہوا ایک حق ہے، وہ ضرور پورا ہو کر رہتا ہے، کبھی ایک شکل میں اور کبھی دوسری شکل میں۔ مثلاً پیغمبر سلیمان پر اللہ کی رحمت کسی شدید امتحان کے بغیر آئی۔ اس کے برعکس، کئی دوسرے پیغمبروں پر اللہ رب العالمین کی رحمت شدید امتحان کے بعد آئی۔ یہاں تک کہ اس وقت جب کہ پیغمبر اور ان کے ساتھی مایوسی کی حالت کو پہنچ گئے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر اچھی چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے، اور اللہ کی رحمت سب سے زیادہ عظیم نعمت ہے۔ اس لیے اس کا استحقاق بھی عظیم قیمت کی ادائیگی کے بعد ہوتا ہے، اور وہ قیمت یہ ہے کہ بندے کو اللہ کی قدرت اور اس کی رحمت پر اتنا زیادہ یقین ہو کہ شدید حالات کے باوجود وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، وہ آخری حد تک اللہ کی رحمت کا امیدوار بنا رہے۔

مذکورہ آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ مایوسی کی آخری حد پر پہنچنے کے بعد اللہ کی نصرت آتی ہے۔ اس مایوسی کا مطلب کیا ہے۔ اس میں دراصل اللہ کے قانونِ فطرت کو بتایا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی نصرت داعی کو ضرور پہنچتی ہے۔ لیکن اس کا پراسس یہ ہے کہ دوسرے انسانوں کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے ایک عمل جاری کیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں داعی کو مطلوب نصرت کبھی تاخیر سے حاصل ہوتی ہے۔ خالق کی طرف سے اس عمل کی تکمیل میں ہمیشہ وقت درکار ہوتا ہے۔ داعی کو چاہیے کہ اس وقت کو وہ انتظار کے خانے میں ڈالے۔ یہ انتظار اگر مایوسی کی آخری حد تک پہنچ جائے، تب بھی داعی کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اس کا رب اس کو تباہی سے بچائے گا، اور اپنے وقت پر وہ ضرور اپنی نصرت کو نازل فرمائے گا، جو داعی کے لیے منزل تک پہنچنے کا سبب بن جائے گا۔ صبر دراصل داعی کی طرف سے انتظار کی مدت کا نام ہے۔ داعی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنی امید کو برقرار رکھے۔ رب کی طرف سے نصرت کی نزول سے وہ مایوس نہ ہو۔

تکرار

''گیتان جلی'' رابندر ناتھ ٹیگور (1861-1941ء) کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب کے انگریزی ترجمہ پر ان کو نوبل انعام ملا تھا۔ یہ کتاب اصلاً بنگلہ زبان میں لکھی گئی تھی، اس کے بعد اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہوا۔ اس کی ایک نظم (نمبر 38) کا ابتدائی مصرعہ یہ ہے:

That I want thee, only thee—let my heart repeat without end.

میں تجھ کو چاہتا ہوں، صرف تجھ کو اور کسی کو نہیں، میرے دل کو اس کی تکرار بے انتہا کرنے دے۔

کسی چیز سے جب آدمی کا تعلق دل چسپی اور محبت کے درجہ کا ہو جائے تو وہاں تکرار (repetition) کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی ہر تکرار آدمی کو نیا لطف دیتی ہے۔ اس کی تکرار سے آدمی کبھی نہیں اکتاتا۔ اس کی ایک عام مثال سگرٹ ہے۔ آدمی سگرٹ کو بار بار پیتا ہے اور روزانہ پیتا رہتا ہے۔ مگر اس کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ ایک چیز کی تکرار کر رہا ہے۔ حالاں کہ اسی شخص کو اگر کوئی غیر مرغوب چیز دی جائے تو چند بار کے استعمال کے بعد وہ اس سے اکتا جائے گا اور اس کو تکرار کہہ کر چھوڑ دے گا۔

میں نے کئی بار ایسے نوجوان دیکھے ہیں جنھوں نے ابھی کوئی پکچر (movie) دیکھی تھی۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اس پکچر (movie) کو دیکھے ہوئے تھا مگر وہ اس کی کہانی اور اس کے مکالمے اس طرح ایک دوسرے کو سنا رہے تھے جیسے کہ وہ کوئی نئی بات کہہ رہے ہوں اور سننے والے اس کو اس طرح سن رہے تھے جیسے وہ بالکل نئی بات سن رہے ہوں۔ پکچر (movie) کے ساتھ ان کی بڑھی ہوئی دل چسپی نے ان کے لیے تکرار کا تصور حذف کر دیا تھا۔

جب کسی کے سامنے کوئی بات کہی جائے اور وہ اس کو ''تکرار'' کہہ کر بے لطف ہونے لگے تو سمجھ لیجیے کہ یہ بات اس کی زندگی میں دل چسپی بن کر داخل نہیں ہوئی ہے۔ اگر وہ اس کے لیے حقیقی دل چسپی کی چیز ہوتی تو اس کی ہر تکرار اس کو نیا لطف دیتی، نہ یہ کہ وہ اس کو بے لطف بنا دے۔

مطالعۂ حدیث

شرح مشکاۃ المصابیح

(حدیث نمبر 85-72)

72

عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان اس سے مایوس ہو چکا ہے کہ جزیرۂ عرب میں نمازی لوگ اس کی پرستش کریں۔ لیکن وہ ان کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے سے مایوس نہیں (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2812)۔

رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے جو انقلاب آیا اس نے مذہبی بت پرستی کو اتنا زیادہ بے بنیاد ثابت کر دیا کہ اب اس قسم کی مشرکانہ روش میں نہ سماجی عزت کا پہلو باقی رہا اور نہ مادی مفاد کا۔ اس لیے امت کے بعد کی نسلوں میں گمراہی کھلی بت پرستی کے راستے سے نہیں آئے گی۔ بلکہ وہ نفس پرستی اور مفاد پرستی کے راستے سے آئے گی۔ اس دوسری گمراہی کا اظہار اس طرح ہوگا کہ لوگ ذاتی مصلحتوں کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے لڑیں گے۔

73

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ میں اپنے دل میں ایسی بات پاتا ہوں کہ زبان سے اس کو بولنے سے زیادہ مجھ کو پسند ہے کہ میں جل کر کوئلہ ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ اس خدا کا شکر جس نے اس طرح کے معاملہ کو وسوسہ قرار دیا (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 5112)۔

موجودہ دنیا میں آدمی فتنوں اور آزمائشوں کے درمیان جیتا ہے۔ اس لیے کوئی آدمی اس سے نہیں بچ سکتا کہ اس کے دل میں غلط قسم کے خیالات آئیں۔ لیکن انسان کی پکڑ بولے ہوئے قول اور کیے ہوئے عمل پر ہے، دل کے اندر گزرے ہوئے خیالات پر نہیں۔

74

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کے اوپر ایک اثر شیطان کا ہے اور ایک اثر فرشتے کا۔ پس شیطان کا اثر تو شر سے ڈرانا اور حق کو جھٹلانا ہے۔ اور فرشتے کا اثر نیکی پر ابھارنا اور حق کی تصدیق کرنا ہے۔ پس جو آدمی اس کو پائے تو اس کو جاننا چاہیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور پھر وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ اور جو شخص دوسری کیفیت اپنے اندر پائے تو وہ شیطان کے مقابلے میں اللہ سے پناہ مانگے۔ پھر آپ نے قرآن (2:268) کی یہ آیت پڑھی: اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور بری بات کی تلقین کرتا ہے) سنن الترمذی، حدیث نمبر 2988۔

انسان کے اندر دو مختلف قسم کے محرکات کی خبر اس لیے دی گئی ہے تاکہ جب وہ اپنی زندگی میں ان میں سے کسی کی علامت دیکھے تو وہ اس کی حقیقت کو پہچان لے۔ ایک علامت پر وہ شیطان سے بچنے کی کوشش کرے اور دوسری علامت پر وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس سے قریب ہو جائے۔

75

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ پوچھ گچھ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ کہا جائے گا کہ مخلوق کو خدا نے پیدا کیا تو خدا کو کس نے پیدا کیا۔ پھر جب لوگ ایسا کہیں تو تم کہو: اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۔ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کے برابر کا نہیں)۔ پھر وہ اپنے بائیں طرف تین بار تُھتکارے، اور شیطان کے مقابلے میں اللہ کی پناہ مانگے (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 4722)۔

یہ حدیث موجودہ دور میں پیدا ہونے والی عقلیت پسندی کی پیشین گوئی ہے۔ مگر اس میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس قسم کا سوال خود وقت کے عقلی نقطہ نظر سے سراسر بے بنیاد ہوگا۔ خدا کا وجود اتنا زیادہ واضح ہے کہ وہ جس طرح پچھلے زمانے میں ثابت شدہ تھا اسی طرح وہ بعد کے زمانے میں بھی ہے۔

اس بحث کے ضمن میں یہ سوال بالکل غیر متعلق ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا۔ خدا اگر پیدا کرنے سے وجود میں آئے تو وہ کائنات کو پیدا کرنے والا نہیں بن سکتا۔ خدا اپنے آپ میں موجود ہے اسی لیے وہ اس کائنات کو وجود میں لاسکا۔ کائنات کی موجودگی خدا کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ اگر ہم خدا کے وجود کا انکار کریں تو ہمیں کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ چونکہ ہم کائنات کے وجود کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں اس لیے ہم خدا کے وجود کا اقرار کرنے پر بھی مجبور ہیں۔

اس معاملے میں خود عقلی سائنس کی رو سے کوئی دوسرا انتخاب ہمارے لیے سرے سے ممکن نہیں۔ جدید سائنس نے کائنات کے ظہور کے بارے میں جو حقائق دریافت کیے ہیں اس کے بعد اب انسان کے لیے انتخاب (choice) بے خدا کائنات اور باخدا کائنات کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات کے درمیان ہے۔ اگر ہم خدا کے وجود کو نہ مانیں تو ہمیں کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ چونکہ ہم کائنات کے وجود کا انکار نہیں کرسکتے اس لیے ہم خدا کے وجود کا بھی انکار نہیں کرسکتے۔ جدید سائنسی دریافتوں کے بعد خدا کے وجود کو ماننا اتنا ہی لازمی بن چکا ہے جتنا کہ کائنات کے وجود کو ماننا۔ (تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتابوں کو دیکھیے: مذہب اور جدید چیلنج، خدا کی دریافت، وغیرہ)

76

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ برابر سوال کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ کہیں گے کہ اگر خدا نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے تو خدا کو کس نے پیدا کیا۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔ اور مسلم کی روایت میں اس طرح ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا تمہاری امت کے لوگ برابر کہتے رہیں گے۔ یہ کیا اور یہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ کہیں گے کہ خدا نے مخلوقات کو پیدا کیا تو خدا کو کس نے پیدا کیا (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 7296؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 136)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے میں جب عقلی بحثوں کا زور بڑھے گا تو خود

امت مسلمہ کے لوگ بھی ذہنی طور پر اس سے متاثر ہوجائیں گے۔ اور وہ بھی وقت کی بولی بولنے لگیں گے۔ اس زمانے میں اس قسم کی گمراہی کا مقابلہ کرنے کے لیے جو فکری جدوجہد دوسرے لوگوں پر کی جائے گی۔ وہی خود امت کی فکری اصلاح کے لیے بھی ضروری ہوگی۔

77

عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول شیطان میرے اور میری نماز اور میری قرأت کے درمیان حائل ہوجاتا ہے اور مجھ پر نماز میں شبہ ڈالتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ شیطان ہے جس کو خِنزَب کہا جاتا ہے۔ پس جب تم اس کو محسوس کرو تو تم اس سے اللہ کی پناہ مانگو۔ اور اپنے بائیں طرف تین بار تھتکارو۔ پس میں نے ایسے ہی کیا تو اللہ نے اس کو مجھ سے دور کردیا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 68)۔

اس حدیث میں جو مخصوص طریقہ بتایا گیا ہے اس کی حیثیت اضافی ہے۔ اس کا اصل مدعا یہ ہے کہ جب بھی کسی آدمی کو یہ محسوس ہو کہ شیطان اس کو خدا کی یاد سے ہٹا رہا ہے تو وہ فوراً تعوذ کے کلمات زبان سے ادا کرکے شیطان سے پناہ مانگے۔ یہ گویا اپنے آپ کو غفلت سے نکال کر شعور کی حالت میں لانا ہے۔ یہ خدا کی مدد سے شیطان کے اوپر قابو پانا ہے۔ قرآن میں رہنمائی کی گئی ہے: جو لوگ ڈر رکھتے ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً (اللہ کو) یاد کرتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے (7:201)۔

78

قاسم بن محمد تابعی سے ایک آدمی نے سوال کیا۔ اس نے کہا کہ مجھے اپنی نماز میں وہم پیش آتا ہے۔ اور یہ مجھ پر بہت گراں گزرتا ہے۔ انھوں نے اس آدمی سے کہا کہ تم اپنی نماز جاری رکھو۔ کیوں کہ یہ چیز تم سے جانے والی نہیں، یہاں تک کہ تم اپنی نماز پوری کرو اور کہو کہ میں نے اپنی نماز پوری نہیں کی (موطا امام مالک، حدیث نمبر 3)۔

اس معاملے کا تعلق جس طرح نماز سے ہے اسی طرح اس کا تعلق دوسرے دینی اعمال سے بھی ہے۔ اس دنیا میں یہ مطلوب نہیں کہ آدمی کا احساس یہ ہو کہ میں نے معیاری عمل کرلیا۔ اس کے

برعکس، آدمی کا احساس یہ ہونا چاہیے کہ مجھ سے معیاری عمل نہ ہوسکا۔ اپنے عمل کو کامل سمجھنا، منافقت کی علامت ہے، اور اپنے عمل کو ناقص سمجھنا اخلاص کی علامت۔

79

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے مخلوق کی تقدیروں کو لکھ دیا ہے، زمین و آسمان کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت اللہ کا تخت پانی کے اوپر تھا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 16)۔

یہاں تقدیر سے مراد منصوبۂ الٰہی ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی زمین میں پہلے پانی کا دور آیا، اس کے بعد سطح زمین پر زندگی کا دور شروع ہوا۔ ہزاروں سال پہلے تقدیر کو لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے پیشگی طور پر اُس کورس کو متعین کر دیا جس کے تحت انسانی قافلے کو اپنا سفر کرنا تھا۔ اور اس فطری قانون کو طے فرما دیا جس کے دائرے میں ہر فرد کو اپنا عمل انجام دینا تھا۔

جدید سائنس کی روشنی میں جب ہم اِس معاملے پر غور کرتے ہیں تو تقدیر کا ایک اہم سُراغ (clue) ڈی این اے (DNA) کی شکل میں ملتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیق بتاتی ہے کہ ہر انسان کا ڈی این اے اس کی شخصیت کا مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ہر انسان کے ڈی این اے میں اس کی شخصیت کی تمام خصوصیات کوڈ کی شکل میں درج ہیں، جن کی مسلسل طور پر ڈی کوڈنگ (de-coding) ہوتی رہتی ہے۔ آدمی کے بیشتر عادات و افعال اسی ڈی این اے کے زیر اثر واقع ہوتے ہیں۔

80

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز مقرر اندازہ پر ہے، یہاں تک کہ عاجزی اور دانش مندی بھی (صحیح مسلم، حدیث نمبر 18)۔

انسانوں کی صلاحیتیں یکساں نہیں۔ اس دنیا میں ہر انسان کو الگ الگ استعداد کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ دنیا کے نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ایسے لوگ بھی درکار ہیں جو جسمانی طاقت میں زیادہ ہوں اور ایسے لوگ بھی جن کے اندر ذہنی طاقت زیادہ پائی جائے۔ یہ مقدرات ہیں، اور وہ اس لیے ہیں تاکہ اس دنیا میں زندگی کا نظام مجموعی طور پر کامیابی کے ساتھ چلتا رہے۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدم اور موسی نے اپنے رب کے سامنے حجت کی تو آدم اس بحث میں موسی پر غالب آ گئے۔ موسی نے کہا کیا آپ وہ آدم ہیں جن کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور آپ کے اندر اپنی روح پھونکی۔ اور اپنے فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا۔ اور آپ کو اپنی جنت میں ٹھہرایا۔ پھر آپ نے اپنی لغزش کی وجہ سے لوگوں کو نیچے اتار دیا۔ آدم نے کہا کہ آپ وہ موسی ہیں جس کو اللہ نے اپنی پیغمبری کے لیے اور اپنی ہم کلامی کے لیے چنا۔ اور آپ کو تختیاں دیں، جس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ اور آپ کو ہم کلامی کے ذریعے قربت دی۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اللہ نے میری پیدائش سے کتنے عرصہ پہلے توراۃ کو لکھ دیا تھا؟ موسی نے کہا کہ چالیس سال پہلے۔ آدم نے کہا کہ کیا آپ نے اس میں لکھا ہوا پایا کہ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی، پھر وہ راستہ سے دور ہو گئے (طہ، 20:121)۔ موسی نے کہا کہ ہاں۔ آدم نے کہا کہ کیا آپ مجھے ایک ایسے فعل کی ملامت کرتے ہیں، جو اللہ نے لکھ دیا تھا کہ میں اس کو کروں، اور یہ میری پیدائش سے چالیس سال پہلے ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر آدم موسی پر غالب آ گئے (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2652)۔

انسان آزاد ہے یا مجبور۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ اس حدیث کا مطلب انسان کو یہ بتانا ہے کہ وہ دو چیزوں کے درمیان ہے۔ ایک تقدیر الٰہی، اور دوسرے ذاتی اختیار۔ انسان ایک اعتبار سے آزاد ہے، اور دوسرے اعتبار سے وہ مجبور ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہر عورت اور مرد آزادانہ طور پر اپنا کام کرتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ بار بار محسوس کرتے ہیں کہ ان کی ذات کے باہر بھی کچھ طاقتیں ہیں جن کو نظر انداز کر کے وہ اس دنیا میں اپنا کام نہیں کر سکتے۔

یہ دو طرفہ تقاضے کیا ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ایک ہے خود انسان کی شخصیت، اور دوسری چیز ہے وہ حالات جن کے درمیان کسی آدمی کو اپنا کام کرنا پڑتا ہے۔ اِن حالات کو فطرت کا قائم کیا ہوا انفراسٹرکچر (infrastructure) کہا جا سکتا ہے۔ جہاں تک انسان کی ذات کا تعلق ہے وہ پوری طرح آزاد ہے۔ انسان کو اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے سوچے، وہ جو بات چاہے بولے، جس رخ پر چاہے اپنی زندگی کا سفر طے کرے۔ اس اعتبار سے انسان مکمل طور پر آزاد ہے۔

دوسری چیز وہ ہے جس کو انفراسٹرکچر کہا جاسکتا ہے۔ یہ انفراسٹرکچر مکمل طور پر فطرت کا قائم کیا ہوا ہے۔ یہ انفراسٹرکچر دنیا میں اپنے آپ قائم ہے۔ انسان کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ وہ اس انفراسٹرکچر کو بدل ڈالے یا اس کو نظر انداز کرکے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔

مثال کے طور پر ایک انسان زمین پر چلتا ہے۔ یہ چلنا انسان کی اپنی آزادی کا معاملہ ہے۔ لیکن اس چلنے کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی کے قدموں کے نیچے ایک زمین ہو۔ اس زمین کے اندر قوتِ کشش ہو، اور پھر انسان کے اوپر ہوا کا دباؤ ہو، وغیرہ۔ یہ چیزیں خارجی انفراسٹرکچر کی حیثیت رکھتی ہیں، اور اس خارجی انفراسٹرکچر کے بغیر چلنے کا عمل ممکن نہیں، نہ کسی عورت کے لئے اور نہ کسی مرد کے لئے۔ یہی معاملہ دوسری ان تمام چیزوں کا ہے جن کے درمیان انسان اپنا عمل کرتا ہے۔

اسی طرح انسان سانس لیتا ہے۔ سانس لینا یا نہ لینا انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے۔ لیکن درست طور پر سانس لینے کے لیے ضروری ہے کہ باہر کی دنیا میں آکسیجن کی سپلائی کا نظام موجود ہو۔ آکسیجن کی مسلسل سپلائی کے بغیر کوئی آدمی سانس نہیں لے سکتا۔ جب کہ سانس کے بغیر انسان کے لئے اس دنیا میں زندہ رہنا ممکن نہیں۔

یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان دو طرفہ تقاضوں کے درمیان ہے۔ ایک اعتبار سے وہ آزاد ہے، اور دوسرے اعتبار سے وہ مجبور ہے۔ اپنے ارادے کے استعمال کے اعتبار سے وہ پوری طرح آزاد ہے۔ لیکن اس اعتبار سے وہ مجبور ہے کہ اپنے ارادے کا آزادانہ استعمال وہ خالق کے مقرر کیے ہوئے انفراسٹرکچر کے بغیر نہیں کرسکتا۔ جبر و اختیار کی اس درمیانی صورتِ حال کو علم العقائد میں وَسَطِیّہ کہا جاتا ہے۔ یہی وسطیہ کا نظریہ اس معاملے میں صحیح نظریہ ہے۔

آدمی اگر صرف پہلی چیز کو یاد رکھے تو اس کے اندر بے عملی پیدا ہوگی۔ اور اگر وہ صرف دوسری چیز کو یاد رکھے تو اس کے اندر غیر حقیقت پسندانہ اعتماد پیدا ہوگا۔ متوازن شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کی نگاہ دونوں حقیقتوں کے اوپر یکساں طور پر رہے۔

82

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا—اور آپ صادق و مصدوق ہیں— تم میں سے ہر ایک کا وجود اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک

نطفہ کی صورت میں رہتا ہے۔ پھر وہ اتنے ہی دنوں تک علقہ کی صورت میں رہتا ہے۔ پھر وہ اتنے ہی دنوں تک گوشت کے ٹکڑے کی صورت میں رہتا ہے، پھر اللہ ایک فرشتہ کو چار باتوں کے ساتھ بھیجتا ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے اس کا کام اور اس کی موت اور اس کا رزق اور یہ کہ وہ شقی ہے یا سعید۔ پھر اس کے اندر روح پھونکی جاتی ہے۔ پس اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں تم میں سے ایک شخص اہل جنت والا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ پھر تقدیر کا لکھا ہوا اس پر غالب آجاتا ہے۔ پھر وہ اہلِ دوزخ کا کام کرتا ہے۔ اور وہ دوزخ میں جا گرتا ہے۔ اسی طرح تم میں کا ایک شخص دوزخیوں کا عمل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہتا ہے۔ پھر تقدیر کا لکھا ہوا اس پر غالب آجاتا ہے۔ اور وہ اہل جنت کا عمل کرتا ہے پھر وہ جنت میں داخل ہوجاتا ہے (متفق علیہ صحیح البخاری، حدیث نمبر 3208؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1)۔

اس حدیث میں ایک مثال کی صورت میں فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ آدمی کے انجام کا دارومدار اس کے آخری عمل پر ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اگر اس کو نیک عمل کی توفیق مل رہی ہے تو وہ اس پر گھمنڈ کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو۔ عین ممکن ہے کہ بعد کو پیش آنے والی کسی آزمائش میں وہ پورا نہ اترے اور اس کی زندگی کا رخ بدل جائے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص برائی میں مبتلا ہو تو لوگوں کو اس سے نفرت نہیں کرنا چاہیے۔ کیا معلوم اس پر کوئی ایسا تجربہ گزرے جو اس کی اصلاح کردے اور اس کی زندگی کا رخ برائی سے نیکی کی طرف مڑ جائے۔

83

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک بندہ اہل دوزخ کا عمل کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اہلِ جنت میں سے ہوتا ہے۔ اور ایک بندہ اہل جنت کا عمل کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اہلِ دوزخ میں سے ہوتا ہے۔ اور اعمال کا اعتبار آخری عمل پر ہے (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 6607، صحیح مسلم، حدیث نمبر 112)۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے انجام کا فیصلہ خصوصی امتحان کے وقت ہوتا ہے۔ یہ روایت کنڈیشننگ (conditioning) کے اصول سے اور بھی واضح ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ ایک

حدیث میں آیا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا لازمی طور پر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ ماحول کا پروڈکٹ بن جاتا ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1385)۔ ایسی حالت میں ایمان قبول کرنا، اس کے ذہن کے لیے ایک ایسی حقیقت کو قبول کرنا ہے جو اس کے لیے بالکل نئی ہے۔ اس لیے ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ آدمی نئی چیز کو متاثر ذہن (conditioned mind) کے ساتھ دیکھے، اور اس کو درست طور پر سمجھ نہ سکے۔ ایسی حالت میں ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایمان لانے سے پہلے پیشگی طور پر ایک کام کرے۔ یعنی اپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ (deconditioning) تاکہ وہ ایمان و معرفت کے آئٹم کو کھلے ذہن کے ساتھ دیکھے، اور بے آمیز صورت میں اس کو لے سکے۔ ایمان گویا تطہیر ذہن (purification of the mind) کا معاملہ ہے۔ اس تطہیر (purification) کے بغیر کوئی بھی شخص ایمان کو حقیقی طور پر نہیں پا سکتا۔ اس کے بغیر اگر وہ ایمان قبول کرتا ہے تو اس کا ایمان، قرآن کے مطابق، داخل القلب ایمان (49:14) نہ ہوگا، بلکہ وہ ایمان لپ سروس (lip service) کے طور پر ہوگا، اور لپ سروس والا ایمان اللہ کے یہاں معتبر نہیں۔

ایک آدمی بظاہر اچھا عمل کرتا ہے مگر کنڈیشننگ کی وجہ سے اس کے دل میں کھوٹ رہتا ہے۔ امتحان کے وقت یہ کھوٹ سامنے آجاتا ہے۔ اور وہ اس کو برے انجام کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی بظاہر برا عمل کرتا ہے مگر اس کے دل کے اندر سچائی کی تلاش کا جذبہ موجود ہوتا ہے، پھر کوئی واقعہ پیش آتا ہے اس کے بعد یہ چنگاری بھڑک اٹھتی ہے اور اس کی زندگی برائی سے ہٹ کر نیکی کے رخ پر چلنے لگتی ہے۔ اس طرح ایک بظاہر برا شخص متلاشیٔ حق ہونے کی بنا پر آخر میں جنتی بن جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس ایک بظاہر اچھا شخص اپنی کنڈیشننگ کی وجہ سے ابدی طور پر ناکام لوگوں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔

84

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک انصاری بچہ کے جنازہ میں بلایا گیا۔ میں نے کہا: اے خدا کے رسول، اسے خوش خبری ہو کہ وہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے جس نے نہ تو گناہ کیا اور نہ گناہ کا وقت پایا۔ آپ نے کہا: اے عائشہ، اس کے سوا بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ نے کچھ جنت والے پیدا کیے جنھیں ان کے باپ کی پیٹھوں میں جنت کے لیے بنایا۔ کچھ آگ والے

پیدا کیے جنھیں ان کے باپ کی پیٹھوں میں دوزخ کے لیے بنایا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2662)۔

اس حدیث میں غالباً اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جنت میں داخلہ کا تعلق عمر سے یا کسی اور نسبت سے نہیں ہے۔ جنت ایک بے حد قیمتی جگہ ہے۔ قرآن کے مطابق، جنت وہ جگہ ہے جہاں تاریخِ انسانی کی ربّانی شخصیات سچائی کی دنیا میں ابدی جگہ پائیں گے (54:55)۔ جنت خدا کے پڑوس (66:11) میں رہنے کا نام ہے۔ اس میں داخلہ کا استحقاق کسی کو صرف اللہ رب العالمین کی رحمت سے ملے گا۔ کوئی اور چیز آدمی کے لیے جنت کی قیمت نہیں بن سکتی۔

85

علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص کا ٹھکانا لکھا جا چکا ہے، یا جہنم میں یا جنت میں۔ لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا ہم اپنے لکھے ہوئے پر بھروسہ کرلیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ عمل کرتے رہو۔ ہر شخص کے لیے اُسی کو آسان کیا جائے گا جس طرف وہ بڑھے گا۔ چنانچہ جو شخص حق کا متلاشی ہو اس کو حق کے راستہ کی توفیق دی جاتی ہے۔ اور جو آدمی اہل شقاوت میں سے ہو تو اس کے لیے ضلالت کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے قرآن کی سورہ اللیل سے یہ آیتیں (10-5) تلاوت فرمائی — پس جس نے مال خرچ کیا اور تقوی کا طریقہ اختیار کیا۔ اور اس نے بھلائی کو سچ مانا۔ تو اس کو ہم آسان راستہ کے لیے سہولت دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور بے پروا رہا۔ اور بھلائی کو جھٹلایا۔ تو ہم اس کو مشکل راستہ کے لیے سہولت دیں گے (متفق علیہ صحیح البخاری، حدیث نمبر 1362؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2039)۔

''آسان راستہ'' یعنی فطری راستہ یا جنت کا راستہ۔ ''مشکل راستہ'' یعنی ابدی ناکامی کا راستہ۔ قرآن کی سورہ اللیل کی مذکورہ آیتوں کی روشنی میں اس حدیث کی تشریح کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جنت یا جہنم کسی کو اتفاقی اسباب سے نہیں ملتی۔ جس آدمی کے اندر سعادت کی چنگاری ہو، یعنی جو سچائی کا متلاشی ہو، اس کو اللہ تعالی قبولیت دے کر اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔ اور جس کے اندر شقاوت کا مرض ہو اس کو ایسے راستے کی طرف ڈھیل دے دی جاتی ہے جو جہنم کی طرف جانے والا ہو۔

ڈائری 1986

5 مارچ 1986

آج کل میرے یہاں دہلی کے دو انگریزی اخبار روزانہ آتے ہیں۔ ایک ہندوستان ٹائمس اور دوسرا ٹائمس آف انڈیا۔ ٹائمس آف انڈیا میں صفحہ 8 پر ہر روز کسی کا قول نقل کیا جاتا ہے۔ اس کی اشاعت (4 مارچ 1986) میں ولیم لا (William Law) کا یہ قول نقل کیا گیا تھا— برائی کا آغاز ہمیشہ گھمنڈ سے ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ ہمیشہ تواضع سے:

Evil can have no beginning, but from pride, nor any end but from humility.

اس کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اسلام (بالفاظ دیگر سچا مذہب) آفاقی صداقتوں کا ہی آسمانی زبان میں اظہار ہے۔ جو آدمی ایک کو جانتا ہو اس کے لیے دوسرے کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ مثلاً ولیم لا نے اپنے مذکورہ مقولہ میں جو بات نفسیات کی زبان میں کہی ہے وہی حدیث میں مذہبی زبان میں اس طرح بیان کی گئی ہے: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ (مسند احمد، حدیث نمبر 4310)۔ یعنی، وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فخر و غرور سب سے بڑی برائی ہے اور انکساری اور تواضع سب سے بڑی نیکی۔ اسی سے تمام دوسری چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ دنیا کی ترقی اور آخرت کی نجات دونوں کا انحصار اسی پر ہے۔ یہاں میں اضافہ کروں گا کہ غرور یا تواضع کا صحیح پتہ عام حالات میں نہیں چلتا۔ اس کا صحیح پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ آدمی کے ساتھ غیر معمولی حالات پیش آئیں۔ جب آدمی کی انا پر چوٹ پڑے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ متکبر تھا یا نہیں۔ اور جب حق کی خاطر دوسرے کے آگے جھکنے کی ضرورت پیش آئے اس وقت اندازہ ہوگا کہ آدمی متواضع تھا یا وہ تواضع کا جھوٹا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا۔

6 مارچ 1986

میری لڑکی فریدہ خانم آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کی لائبریری میں گئی تھی۔ واپس آ کر اس نے بتایا

کہ میں لائبریری کے ریڈنگ روم میں بیٹھ کر کچھ پڑھ رہی تھی، مگر پڑھنا مشکل ہو گیا۔ میں پڑھتی جاتی تھی مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریب کی میز پر ایک لڑکی چند لڑکوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ لوگ بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے۔ خاص طور پر لڑکی کا یہ حال تھا کہ مسلسل زور زور سے بول رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کی وجہ سے ریڈنگ روم میں سکون کا ماحول بالکل ختم ہو گیا تھا۔

یہ واقعہ سن کر مجھے وہ بات یاد آئی جو ایک سیاح نے لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میں امریکا گیا۔ وہاں ایک لائبریری میں بھی گیا اور اس کے ریڈنگ روم میں کچھ دیر بیٹھا۔ وہاں ریڈنگ روم میں نوجوان لڑکیاں آتی جاتی تھیں، مگر وہ حد درجہ محتاط تھیں۔ وہ چلنے میں اس کا بھی لحاظ کرتی تھیں کہ ان کے کپڑوں کی سرسراہٹ سے خلل نہ ہو۔ اسی طرح جو لڑکے اور لڑکیاں میزوں پر جھکے ہوئے مطالعہ کر رہے تھے وہ مطلق کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جب انہیں اپنی زیر مطالعہ کتاب کا ورق الٹنا ہوتا تھا تو اس کو بھی نہایت آہستگی سے الٹتے تھے تاکہ کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ نہ پیدا ہو۔ ریڈنگ روم کا ہر شخص حد درجہ اس کا خیال کر رہا تھا کہ اس کا کوئی فعل دوسرے لوگوں کے لیے خلل اندازی کا باعث نہ ہو۔

کتنا فرق ہے ایک انسان میں اور دوسرے انسان میں۔ کتنا فرق ہے ایک معاشرے میں اور دوسرے معاشرہ میں۔

7 مارچ 1986

قرآن مجید میں ہے: وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ (7:188)۔ اور اگر میں غیب کو جانتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا۔

یہ بہت بامعنی الفاظ ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا کے فوائد کا بہت گہرا تعلق غیب سے ہے۔ اکثر ناپسندیدہ حالات صرف اس لیے پیش آتے ہیں کہ آدمی پیشگی طور پر ان کا اندازہ نہ کر سکا تھا۔

بعض اوقات آدمی غیر متوقع طور پر انتہائی شدید حالات میں گھر جاتا ہے۔ وہ اس سے اتنا زیادہ پریشان ہوتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حوصلہ کھو دے گا۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ناخوش گوار صورت حال اکثر اس سے بہت کم ناخوش گوار ہوتی ہے جتنا آدمی اس کے بارے میں سمجھ لیتا ہے۔

آدمی پر جب کوئی افتاد پیش آتی ہے تو پریشانی میں وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ ایک بھیانک مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض لوگ آنے والے قیاسی خطرات سے گھبرا کر خودکشی کر لیتے ہیں یا کم از کم اپنی صحت برباد کر لیتے ہیں۔ مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ اس طرح کے مواقع پر عموماً ایسا ہوتا ہے کہ مستقبل اس سے کم خطرناک نکلتا ہے جیسا کہ آدمی نے متاثر ذہن کے تحت اس کو سمجھ لیا تھا۔ جب کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مشکل میں ایک آسانی نکل آتی ہے۔ کھونا اپنے انجام کے اعتبار سے پانا بن جاتا ہے۔

8 مارچ 1986

آج میری کتاب ''پیغمبر انقلاب'' کا انگریزی ترجمہ پہلی بار چھپ کر آیا۔ اس کا نام ہے:

Mohammad: The Prophet of Revolution (Presently available as The Life of Muhammad)

میں نے اس کو دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ صرف اللہ کا فضل خاص ہے کہ اسلامی مرکز کا کام اس طرح چل رہا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے۔ ورنہ میرے اپنے بس میں تو کچھ بھی نہ تھا۔

غالباً 1970ء کی بات ہے۔ مجھے یہ خیال آیا کہ میں اپنی بعض کتابوں کا انگریزی ترجمہ شائع کروں۔ اس سلسلے میں مختلف مترجمین سے رابطہ کیا۔ مگر کوئی مجھے پسند نہ آسکا۔ آخر کار معلوم ہوا کہ اردو سے انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے سب سے بہتر شخص ڈاکٹر آصف قدوائی ہیں۔ وہ مولانا علی میاں اور دوسرے حضرات کی دینی کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے۔ اس طرح اس میدان کا خصوصی تجربہ رکھتے تھے۔ میں نے ان کو خط لکھا۔ ان کا چند سطور کا جواب آیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میرے پاس ترجمے کے لیے اتنے کام جمع ہیں کہ اگر میں مزید 15 سال زندہ رہوں تو صرف موجودہ کتابوں کے ترجموں کو مکمل کر پاؤں گا۔ جب کہ مزید کتابوں کی آمد بدستور جاری ہے۔

بظاہر ایسا محسوس ہوا کہ مجھے یہ خوش قسمتی کبھی حاصل نہ ہوگی کہ میری کوئی کتاب انگریزی میں عمدہ زبان میں شائع ہو۔ مگر اس کے بعد حالات میں تبدیلی ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انگریزی کے لیے ایسے اعلیٰ انتظامات فراہم کر دیے کہ یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر انقلاب جیسی عمدہ انگریزی

زبان میں ترجمہ ہو کر چھپی ہے ویسی عمدہ انگریزی زبان میں ابھی تک کسی بھی اسلامی ادارے کی کوئی کتاب شائع نہ ہوسکی۔ الحمدللہ علی ذالک۔

9 مارچ 1986

آج ہندستان ٹائمس کے سنڈے میگزین میں ایک کتاب پر تبصرہ شائع ہوا ہے:

The Viceroys of India by Mark Bence-Jones, pp. 343, 1982

یہ کتاب ہندستان کے برٹش راج کا تفصیلی ریکارڈ ہے۔ ہندستان میں برٹش راج 175 سال تک رہا۔ اس مدت میں کل 29 گورنر جنرل (وائسرائے) مقرر ہوئے۔ پہلے برٹش گورنر جنرل وارن ہیسٹنگر (Warren Hastings, 1732-1818) تھے جو 1774ء میں کلکتہ آئے اور آخری برٹش وائسرائے لوئی ماؤنٹ بیٹن (Louis Mountbatten, 1900-1979) تھے جو جون 1948ء میں شاندار الوداعی پارٹی کے بعد دہلی سے واپس ہو کر انگلستان گئے۔

انگریزوں نے ایک طرف قومی شعور کا زبردست ثبوت دیا۔ اپنے مرکز سے غیر معمولی دوری کی بنا پر ہر وائسرائے کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ بغاوت کر کے ہندستان میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لے۔ مگر 29 وائسرائے میں سے کسی نے بھی اس قسم کا باغیانہ منصوبہ نہیں بنایا۔ مگر یہی لوگ جو آپس میں لڑنے کو حد درجہ غلط سمجھتے تھے انہوں نے ہندستان میں اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کا جو سب سے بڑا راز دریافت کیا وہ یہ تھا: ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' (Divide and Rule)۔

لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin, 1826-1902) نے 1885ء میں ہندو مسلم جھگڑے شروع کروائے۔ اس کے بعد وہ بڑھتے ہی رہے۔ انگریزی حکومت 1947ء میں ختم ہوگئی، مگر ہندو مسلم جھگڑے آج بھی ختم ہوتے ہوئے نظر نہیں آرہے ہیں۔ شاید ہمالیہ کی سرزمین فرقہ وارانہ جھگڑوں کے لیے بہت زرخیز ہے۔

10 مارچ 1986

تقریباً روزانہ میری نیند فجر سے پہلے کھل جاتی ہے۔ ابھی میں بستر ہی پر ہوتا ہوں کہ دل سے دعا کے کلمات نکلنے لگتے ہیں، اور یہ بالکل بے ساختہ طور پر ہوتا ہے۔ یہ گویا قرآن کے الفاظ ''وَعَلٰی

جُنُوْبِهِمْ ‘‘(3:191) کا ایک تجربہ ہوتا ہے، اور یہ روزانہ مجھ پر گزرتا ہے۔ یعنی، اور وہ اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔

آج فجر سے پہلے نیند کھلی۔ میں ابھی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرہ میں، میں بالکل تنہا تھا اور کمرہ میں اندھیرا تھا۔ مگر دل سے مسلسل دعائیں نکلنے لگیں، بالکل ویسے ہی جیسے کسی مادہ سے اس کی فطری خاصیت اپنے آپ ظاہر ہو۔ خدایا مجھے بخش دے، خدایا مجھ پر رحم فرما، خدایا تو دنیا و آخرت میں میرا مددگار ہو جا۔

میں ان دعاؤں میں مشغول تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ دعا کائنات کا ایک انوکھا مظہر ہے۔ جس طرح مادہ سے ایک خاصیت کا ظاہر ہونا، اس مادہ کے اندر ایک متعین خاصیت کی موجودگی کا ثبوت ہوتا ہے، اسی طرح انسان کے اندر دعا کا نکلنا خدا کی موجودگی کا قطعی اور یقینی ثبوت ہے۔

دعا کیا ہے؟ دعا ایک ہستی کو دیکھے بغیر پکارنا ہے۔ ایک ہستی جو آس پاس کہیں نظر نہ آ رہی ہو، اس سے اس طرح ہم کلام ہونا جیسے کہ وہ ہمارے بالکل قریب موجود ہے۔ اس طرح انسان کسی اور کو نہیں پکارتا۔ نہ اپنے دوستوں کو، نہ کسی حکمراں کو، نہ سورج اور چاند کو۔ کسی کی غیر موجودگی میں اس کو پکارنا اور اس سے ہم کلام ہونا خاص الخاص صرف خدا کے لیے ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ مشرک اور ملحد بھی نازک وقتوں میں اپنی مزعومہ ہستیوں کو نہیں پکارتے۔ ایسے موقع پر ان کے دل سے بھی جب پکار نکلتی ہے تو خدا ہی کے لیے نکلتی ہے۔

یہ اس بات کا نفسیاتی ثبوت ہے کہ یہاں ایک عظیم ہستی ہے جو سنتی اور جانتی ہے اور جس کو ہر قسم کا اختیار حاصل ہے۔

11 مارچ 1986

علی گڑھ سے ایک نوجوان آئے۔ وہ مسلم یونیورسٹی میں انجینئرنگ کے فائنل ایئر میں ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ علی گڑھ کے مسلمان طلبا اپنی تحریک ہمیشہ اسلام کے نام پر چلاتے ہیں۔ حالاں کہ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انہوں نے علی گڑھ کے مسلم طلبا کی حمایت کی اور کہا کہ آپ کی یہ بات درست نہیں۔ ہمارے یہاں کے طلبا میں زبردست اسلامی جذبہ ہے۔ اس

ملک میں وہ اسلامی زندگی کا نشان ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا کہ علی گڑھ کے مسلم طلبا اسلام کا نام تو ضرور لیتے ہیں مگر ان کی سرگرمیوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس کی مثال دیجیے۔ میں نے کہا کہ ہاں میں آپ کو ایک متعین مثال دیتا ہوں۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ پروفیسر عرفان حبیب (پیدائش 1931ء) کے مسئلے کو لیجیے۔ جن کے خلاف مسلم لڑکوں نے اتنے ہنگامے کیے کہ یونیورسٹی بند کر دینی پڑی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اخبار انڈین اکسپریس (3 جنوری، 1981) میں پروفیسر عرفان حبیب کا ایک انٹرویو چھپا۔ اس انٹرویو پر علی گڑھ کے مسلم طلبا کو سخت اعتراض ہوا۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ اس انٹرویو میں خالص حقیقت کے اعتبار سے کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی۔ تاہم اس سے قطع نظر اس انٹرویو کے خلاف مسلم طلبا نے جو کچھ کیا وہ سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا۔ مثلاً مسلم طلبا نے پروفیسر عرفان حبیب پر اسٹک سے حملہ کیا۔ اگرچہ اتفاقی طور پر وہ بچ گئے۔

اب میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر تم بدلہ لینا چاہو تو اس کے مثل بدلہ ہو جو تمہارے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس قرآنی حکم کے مطابق اسلامی طریقہ یہ تھا کہ آپ پروفیسر عرفان حبیب کے مضمون کے جواب میں خود بھی ایک مضمون شائع کر دیتے۔ مگر قلم کا جواب ڈنڈے سے دینا اس قرآنی حکم کے سراسر خلاف ہے۔ پھر ایسی تحریک کو آپ کس طرح اسلامی تحریک کہہ سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں وہ خاموش ہو گئے۔

12 مارچ 1986

اخبار ٹائمس آف انڈیا کا ایک سپلیمنٹ Woman کے نام سے نکلا۔ یہ 8 مارچ 1986 کے اخبار کے ساتھ مجھے ملا تھا۔ مگر فوراً میں اس کو نہ پڑھ سکا تھا۔ اب آج اس کو دیکھا۔ اس میں ایک طویل مضمون مدھو کشور (پیدائش 1951ء) کا ہے۔ یہ ایک ہندو خاتون ہیں جو منوشی (Manushi) نامی فیمینزم میگزین کی ایڈیٹر ہیں۔ اس مضمون کا عنوان ہے:

Another Look at the Shah Bano Controversy

محترمہ مدھو کشور کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کافی آزاد خیال ہیں۔ حتیٰ کہ جناب توقیر صاحب کے بیان کے مطابق وہ میرج کے انسٹی ٹیوشن میں یقین نہیں رکھتیں۔ ان کے اس مضمون میں جو بات سب سے زیادہ ابھری ہوئی ہے وہ ان کے الفاظ میں عورت پر مرد کے تسلط کے خلاف احتجاج ہے۔ اس مضمون میں گویا انہوں نے مرد کے خلاف اپنا بخار نکالا ہے۔ ان کا ایک جملہ یہ ہے:

Through centuries, most men have used religion to legitimise their unjust domination of women in most parts of the world.

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ہر گروہ ایک ہی مقام پر ہے۔ مدھو کشور شاہ بانو کے معاملہ کو آڑ بنا کر مرد کے خلاف اپنا بخار نکال رہی ہیں۔ ہندو عناصر اس معاملہ کو لے کر مسلمانوں کے خلاف اپنا بخار نکال رہے ہیں اور مسلم پرسنل لا کا تحفظ کرنے والے لوگ شاہ بانو کیس کو بہانہ بنا کر ہندوؤں کے خلاف اپنا بخار نکال رہے ہیں۔

ہر آدمی اپنے دل کا بخار نکالنے میں مصروف ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی شخص ایک کے خلاف اپنا بخار نکال رہا ہے اور کوئی شخص دوسرے کے خلاف۔

13 مارچ 1986

احمداللہ بختیاری (رائچوٹی) ایک نوجوان ہیں۔ وہ آج ملنے کے لیے آئے۔ وہ ریاض (سعودی عرب) کی جامعہ الامام سے فارغ ہیں۔ وہاں انہوں نے سات سال رہ کر عربی ادب کی تکمیل کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں ان کے ایک استاد ڈاکٹر محمد علی الہاشمی تھے جو کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے شاگرد ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی الہاشمی نے ادیب کی تعریف ان الفاظ میں کی: الادیب ما یلعب بالالفاظ (ادیب وہ ہے جو الفاظ کے ساتھ کھیلے)۔ اس کو الفاظ پر اتنا قابو ہو کہ جس لفظ کو جہاں چاہے رکھے اور جہاں سے چاہے ہٹائے۔

میں نے کہا کہ ادب کی یہ تعریف ادب کے قدیم تصور پر مبنی ہے۔ ادب کا ایک تصور وہ ہے جس کی نمائندگی مقامات حریری جیسی کتابیں کرتی ہیں۔ ان میں سارا زور الفاظ پر ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ادب کا کمال یہ ہے کہ وہ مسجع اور مقفیٰ عبارت لکھ سکے۔ پہلا جملہ جس لفظ پر ختم ہوا ہے دوسرے

جملے کے خاتمے کے لیے بھی اس کو ویسا ہی لفظ مل جائے۔ مثلاً قدیم عرب کے مشہور مقرر قس بن ساعدہ ایادی کی تقریر کا ایک جملہ یہ ہے: طَحَنَهُمُ الثَّرَى بِكَلْكَلِهِ، وَمَزَّقَهُمْ بِتَطَاوُلِهِ (دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 2، صفحہ 109)۔

قدیم زمانہ میں شاعری کا زور تھا۔ اس لیے قدیم زمانہ میں الفاظ کی موزونیت باعتبار آہنگ پر زور دیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں سائنس کا زور ہے۔ اس لیے اب الفاظ کی موزونیت باعتبار معنیٰ پر زور دیا جاتا ہے۔ قدیم تصور کے مطابق ذخیرۂ الفاظ کی زیادہ اہمیت تھی، مگر اب ادراک معنیٰ کی زیادہ اہمیت ہے۔ قدیم تصور ادب کے مطابق آدمی کے پاس الفاظ کا ڈھیر جتنا زیادہ ہو اتنا ہی زیادہ وہ موزوں جملے بنا سکتا تھا۔ مگر جدید تصور ادب کے مطابق جس شخص کا ادراک جتنا زیادہ بڑھا ہوا ہو اتنا ہی زیادہ موزوں الفاظ (appropriate words) اس کی زبان وقلم سے ظاہر ہوں گے۔

14 مارچ 1986

میں تذکیر القرآن (سورہ العنکبوت) کے کتابت شدہ صفحات برائے تصحیح دیکھ رہا تھا۔ درمیان میں اس کے ایک صفحہ کی نقل لینے کی ضرورت پیش آئی۔ ہمارے دفتر میں فوٹو کاپی مشین ہے۔ میں نے انٹرکام (intercom) پر نیچے بتایا۔ نیچے کے دفتر سے ایک آدمی آیا۔ اس کو میں نے مذکورہ صفحہ دیا۔ وہ صفحہ کو لے گیا اور اسی وقت اصل اور کاپی لا کر مجھے دے دی۔

مذکورہ صفحہ کی نقل ایک منٹ بعد میرے سامنے موجود تھی۔ عین وہی صفحہ بالکل صاف اور صحیح شکل میں چھپا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھ پر عجیب تاثر ہوا۔ میں نے کہا— قدیم زمانہ میں کسی صفحہ کی ایسی ایک نقل حاصل کرنا کس قدر دشوار اور کتنا دیر طلب کام تھا۔ آج یہ حال ہے کہ آدمی اس کو ایک منٹ میں حاصل کر لیتا ہے۔ یہ بلاشبہ خدا کا معجزہ ہے۔ ان واقعات کی موجودگی میں جو لوگ معجزہ طلب کریں وہ اندھے ہیں۔ اگر وہ بینا ہوتے تو یقیناً انہیں واقعات میں وہ معجزۂ خداوندی کو دیکھ لیتے۔

پھر میں نے سوچا کہ نزول قرآن سے پہلے خدا کی طرف سے برابر معجزے آتے رہے۔ مگر نزول قرآن کے بعد معجزات کی آمد بند ہو گئی۔ اس کی وجہ غالباً نزول قرآن کے بعد دور سائنس کا آنا اور اس کے ذریعے قدرت کے بے شمار عجائبات ظہور میں آنا ہے۔ قرآن کے بعد سائنس کا زمانہ آرہا

تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بعد معجزات کو بھیجنا بند کر دیا۔

15 مارچ 1986

جماعت اسلامی کے دو صاحبان ملنے کے لیے آئے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تقسیم ہند کے وقت مدراس میں ایک تقریر کی تھی، جس میں انہوں نے ہندستان میں تحریک اسلامی کا لائحہ عمل بتایا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ آزاد ہندستان میں سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قومی کشمکش کو ختم کیا جائے، اس کے بغیر ہندستان میں اسلامی دعوت کا کام نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے کہا کہ یہ ایک نہایت اہم اور بنیادی بات تھی مگر جماعت اسلامی ہند اس پر نہ چل سکی۔ جماعت اسلامی ہند اگرچہ اسلامی دعوت کا نام لیتی ہے، مگر اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کی ان نام نہاد ملّی سرگرمیوں میں بھی شریک ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قومی کشمکش پیدا کرنے والے ہیں۔ مولانا مودودی کی رہنمائی اگرچہ بذات خود صحیح تھی، مگر وہ پوری بات نہ کہہ سکے۔ معاملہ کے نصف تک ان کی نظر پہنچی، مگر معاملہ کا دوسرا نصف ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا۔

ہندوستان میں قومی کشمکش کا ختم ہونا بلاشبہ انتہائی ضروری ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کو کون ختم کرے۔ ہمارے تمام مسلم قائدین قومی کشمکش کے خاتمہ کا نام لیتے ہیں، مگر وہ چاہتے ہیں کہ دونوں قومیں اس کو ختم کریں، اور یہ یقینی طور پر ناممکن ہے۔ اس طرح کی چیزیں جب بھی ختم ہوتی ہیں، یک طرفہ طور پر ختم ہوتی ہیں۔ مسلمان اگر یک طرفہ طور پر اپنے تمام جھگڑے ختم کر دیں تو قومی کشمکش بھی ختم ہو جائے گی اور اسلامی دعوت کے لیے موافق ماحول پیدا ہو جائے گا۔ لیکن اگر مسلمان یک طرفہ طور پر اس کشمکش کو ختم نہ کریں تو وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ اس ملک میں کبھی اسلامی دعوت کے لیے وسیع موافق میدان پیدا ہو۔

17 مارچ 1986

پروفیسر کارل سگن (Carl Sagan, b. 1934) ایک ممتاز امریکی فلکیات داں ہیں۔ وہ اس وقت نیویارک کی کارنیل یونیورسٹی میں خلائی مطالعہ کے استاد ہیں۔ کارل سگن کا ایک مضمون

ہندوستان ٹائمس 15 مارچ 1986 میں شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے:

Are there other planetary systems?

اس مضمون میں انہوں نے دکھایا ہے کہ کائنات کی ساری وسعتوں کے باوجود ابھی تک اس میں ہمارے شمسی نظام کے سوا کسی اور شمسی نظام کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ زبردست زمینی اور خلائی مشاہدات کے باجود ابھی تک سائنس داں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری زمین جیسا کوئی کرہ یا شمسی نظام جیسا کوئی نظام وسیع کائنات میں موجود ہے بھی یا نہیں۔ زمین جیسا سیارہ (Earth like Planet) ہماری کائنات کا انتہائی نادر واقعہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

If other planetary systems are absent, we might have to reconcile ourself to a long cosmic loneliness.

اگر دوسرے سیاراتی نظام موجود نہیں ہیں تو ہمیں ایک طویل کائناتی تنہائی پر راضی ہو جانا چاہیے۔

زمین یا سیاراتی نظام کا کائنات میں ایک مستثنیٰ واقعہ ہونا واضح طور پر ارتقائی پیدائش کی تردید ہے۔ کوئی استثنائی واقعہ شعوری تخلیق کا نتیجہ ہوتا ہے، نہ کہ اندھے ارتقائی عمل کا نتیجہ۔ اندھا ارتقائی عمل لازماً یکسانیت چاہتا ہے۔ اندھے ارتقائی عمل میں اس طرح کا بامعنیٰ استثناء ہرگز ممکن نہیں جیسا بامعنی استثناء ہماری زمین ہے۔

18 مارچ 1986

مولانا محمد رفیق کانپوری ایم اے، ایل ایل بی، ملنے کے لیے آئے۔ وہ آج کل سعودی عرب میں رہتے ہیں۔ وہ عجیب وغریب صلاحیتوں کے آدمی ہیں۔ وہ کئی زبانیں جانتے ہیں اور بیک وقت روانی کے ساتھ بول سکتے ہیں۔

وہ اپنی زندگی کے مختلف واقعات سناتے رہے۔ کبھی اپنا کوئی واقعہ سناتے ہوئے اپنی کوئی گفتگو انگریزی میں دہرانے لگے۔ کبھی کسی دوسرے واقعہ کا ذکر ہوا جس میں انہوں نے عربی میں کلام کیا تھا اور وہ اس کو عربی میں نقل کرنے لگے۔ پھر انہوں نے اپنی ایک ہندی تقریر کا قصہ بتایا اور

اس کے بعد وہ بے تکلف ہندی میں بولنے لگے۔

اسی طرح وہ کبھی اردو میں، کبھی انگریزی میں، کبھی عربی میں اور کبھی ہندی میں بولتے رہے۔ میں نے سوچا کہ انسان کو بھی اللہ تعالیٰ نے کیسی عجیب صلاحیت دی ہے۔ ریڈیو پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ہندی نشریات سن رہا تھا اور پھر سوئچ گھما کر انگریزی نشریات سننے لگا۔ دوبارہ سوئچ گھمائی تو عربی نشریات سنائی دینے لگیں۔ انسانی دماغ بھی گویا اسی قسم کا زیادہ اعلیٰ (superior) ریڈیو ٹیپ ہے۔ وہ ایک زبان سے دوسری زبان، دوسری سے تیسری زبان اور تیسری زبان سے چوتھی زبان کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے بغیر اس کے کہ اس میں کوئی تاخیر ہوئی ہو۔

ریڈیو تو بولی ہوئی آواز کو دہراتا ہے، مگر انسان کا دماغ خود اپنے شعور کے تحت مختلف زبانوں میں کلام کی تخلیق کرتا ہے اور اس کو زبان کے ذریعہ سامنے لاتا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ دماغ اور کیسا عجیب ہے وہ خالق جس نے اس دماغ کو خلق کیا۔

19 مارچ 1986

19 مارچ 1986 کو میں نے انڈین ایئر لائنز کے ذریعہ دہلی سے پونے کا سفر کیا۔ میرا ٹکٹ نمبر 0582/8736912 تھا۔ یہ ٹکٹ دہلی کے دفتر سے 2128 روپیہ میں لیا گیا تھا۔ مگر اس کے چند دن بعد انڈین ایئر لائنز نے اعلان کیا کہ 18 مارچ سے اس نے اپنی تمام پروازوں کے کرائے بڑھا دیے ہیں۔ یہ ٹکٹ یکم مارچ کو خریدا گیا تھا۔ مگر سفر چونکہ 19 مارچ کو ہوا اس لیے ہم کو اضافہ شدہ کرایہ مزید ادا کرنا پڑا۔

میں نے سوچا، اگر میں انڈین ایئر لائنز سے شکایت کروں کہ آپ نے ٹکٹ کی خریداری کے وقت مزید رقم کیوں نہ لی تو یہ ایک احمقانہ بحث ہوگی۔ کیونکہ کرایہ سفر کی قیمت ہے۔ اس لیے کرایہ کا اعتبار وقت سفر کے لحاظ سے ہوگا، نہ کہ وقت خریداری کے لحاظ سے۔

''یکم مارچ'' کو میں اس ٹکٹ کے ذریعے سفر کرنے کا مجاز تھا۔ مگر ''19 مارچ'' کو میں اس ٹکٹ کے ذریعے سفر کرنے کا مجاز نہ رہا، الّا یہ کہ میں اضافہ شدہ رقم ادا کروں۔ اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے، چنانچہ وہ اپنی زندگی کے معاملات میں بار بار غلطیاں کرتے ہیں۔ وہ پرانے ٹکٹ پر نیا

سفر کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب انہیں سفر کی اجازت نہیں ملتی تو وہ دوسروں کی شکایت کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ ظلم کیا جارہا ہے۔ حالاں کہ یہ ظلم نہیں، یہ زندگی کا ایک اصول ہے۔ جو لوگ اس کو ظلم کہیں وہ صرف یہ اعلان کررہے ہیں کہ وہ زندگی کی حقیقت کو نہیں جان سکے۔

20 مارچ 1986

آج (20 مارچ 1986) کو مجھے حسب پروگرام پونہ میں درس قرآن دینا تھا۔ کئی روز سے میں اس سوچ میں تھا کہ قرآن کے کس حصہ کا درس دیا جائے۔ پچھلی رات کو دہلی میں خواب دیکھا کہ بہت سے لوگ کسی مقام پر جمع ہیں اور میں ان کے درمیان قرآن کا درس دے رہا ہوں۔ یہ درس سورہ آل عمران کے آخری رکوع (آیات 200-190) کا تھا۔

یہ گویا غیبی اشارہ کے تحت اس بات کا تعین تھا کہ کس حصہ قرآن کا درس دیا جائے۔ چنانچہ میں نے مذکورہ رکوع کو عربی تفسیروں میں دیکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے تحت صحابہ وتابعین کے بڑے قیمتی اقوال اور واقعات موجود ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کو نوٹ کرلیا اور ان کے مطابق درس کی تیاری کی۔

جدید نظریہ یہ ہے کہ اس قسم کا خواب لاشعور کا کرشمہ ہوتا ہے۔ مگر ایمانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ خدائی بشارت ہے۔ میرے اس طرح خواب کے ذریعہ نہ صرف درس کے لیے رکوع کا تعین آسان ہوگیا، بلکہ خود میرے لیے معرفت کا نیا دروازہ کھلا۔ خاص طور پر ''تفسیر ابن کثیر'' میں اتنے قیمتی اقوال ملے کہ اس کو پڑھتے ہوئے آنکھیں تر ہوگئیں۔

21 مارچ 1986

21 مارچ کو میں پونا میں تھا۔ ایک مجلس میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران ایک صاحب بولے، جن کا نام آفتاب احمد تھا۔ انہوں نے میرے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''مولانا وحید الدین صاحب وہ شخصیت ہیں جن کو آج ساری دنیا جانتی ہے۔ وہ ایک سفر کے دوران افریقہ کے ایک ہوائی اڈہ پر پلین کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس ہوائی اڈہ سے لیبیا

کے صدر معمر قذافی کا گزر ہوا۔ ان کو معلوم ہوا کہ مولانا یہاں ہوائی اڈہ پر ہیں تو ہوائی جہاز سے اتر کر مولانا کے پاس آئے اور عقیدت مندی کے ساتھ ملاقات کی‘‘۔

جناب آفتاب صاحب نے مذکورہ بات عین میری موجودگی میں کہی۔ انہیں اپنے اس بیان پر صد فیصد یقین تھا۔ حالاں کہ یہ سراسر بے بنیاد واقعہ ہے۔ اس قسم کا کوئی واقعہ میرے ساتھ کبھی پیش نہیں آیا۔ اس بیان میں کوئی ادنیٰ صداقت بھی نہیں ہے۔

میرے ساتھ اس طرح کے دوسرے بہت سے واقعات گزرے ہیں جن سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بزرگوں کی بابت جو قصے کہانیاں عام طور پر مشہور ہیں یا کتابوں میں درج ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ یہ وہی بات ہے جس کو کسی نے اپنے فارسی مقولہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

پیراں نمی پرند مریداں می پرانند

یعنی، پیر نہیں اڑتے بلکہ مریدان کو اڑاتے ہیں۔ عقیدت مند لوگ اپنی صاحب عقیدت شخصیت کے بارے میں بطور خود افسانے بنا لیتے ہیں اور اس کو لوگوں سے بیان کرنے لگتے ہیں۔ یہ افسانے بعد کے زمانہ میں مقدس ہو کر اس طرح مان لیے جاتے ہیں جیسے کہ وہ واقعہ ہوں۔

22 مارچ 1986

پونا میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں اور سائنس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں قرآنی تفسیر کے بارے میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ میری بہت سی تحقیقات ہیں جو میں نے قرآن اور سائنس کے بارے میں کی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو قلم بند کروں۔

میں نے پوچھا کہ کوئی تحقیق بطور مثال بتائیے۔ انہوں نے قرآن کی سورۃ الہمزہ کی یہ آیت پڑھی: كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (104:4)۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے: ہرگز نہیں، وہ ضرور پھینکا جائے گا روندنے والی جگہ میں۔

انہوں نے کہا کہ لوگ اس آیت کو سمجھ نہیں سکے۔ یہاں حطمہ سے مراد ایٹم ہے۔ ’’وہ حطمۃ میں پھینکا جائے گا‘‘ کا مطلب ہے وہ ایٹم میں پھینک دیا جائے گا۔ یعنی ایٹمی بھٹی میں۔ چونکہ حطمۃ اور

ایٹم میں صوتی مشابہت ہے اس لیے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ حطمۃ سے مراد ایٹم ہے۔

انہوں نے بڑے جوش اور یقین کے ساتھ اپنی یہ تفسیر بیان کی اور میں یہ سوچتا رہا کہ جوش اور یقین بھی کیسی عجیب چیز ہے، وہ ایسی باتوں پر بھی پیدا ہوسکتا ہے جس کی سرے سے کوئی بنیاد ہی نہ ہو۔

موجودہ زمانہ میں اس قسم کے بہت سے نام نہاد مفسرین پیدا ہو گئے ہیں جو بزعم خود قرآن کی سائنسی تفسیر کررہے ہیں۔ ان کی اسی قسم کی بے معنی باتوں کی وجہ سے دینی طبقہ کو سائنسی تشریح کے لفظ سے چڑھ ہوگئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سائنسی تشریح مذکورہ قسم کی باتوں کا نام ہے۔ حالاں کہ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے جاہلانہ تشریح ہے، نہ کہ سائنسی تشریح۔

23 مارچ 1986

آج ایک صاحب ملنے کے لیے تشریف لائے۔ وہ جماعت اسلامی کے رکن ہیں۔ نیز جماعت اسلامی کے شعبہ تصنیف وتالیف سے وابستہ ہیں۔ اسلام کے موضوع پر ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔

گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے امت مسلمہ کا نصب العین حکومت الٰہیہ کا قیام بتایا ہے۔ مگر یہ نصب العین کسی بھی آیت یا حدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔

میں نے کہا، اس میں شک نہیں کہ آپ حضرات نے اس کے حق میں بہت سی دلیلیں دی ہیں، مگر وہ سب کی سب استنباطی ہیں اور استنباطی دلیل اس معاملہ میں قابل اعتبار نہیں۔

میں نے کہا کہ فقہاء نے استدلال کے چار طریقے بتائے ہیں: عبارت النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص۔ مگر یہ چار حقیقتاً صرف دو ہیں۔ ایک براہ راست استدلال (direct argument) اور دوسرا بالواسطہ استدلال (indirect/inferential argument)۔ اب دینی امور کے دو حصے ہیں۔ ایک کلیاتِ دین (basics of religion) اور دوسرا جزئیاتِ دین (nonbasics of religion)۔ بالواسطہ استدلال یا بالفاظ دیگر استنباطی استدلال صرف جزئیاتی امور میں کارآمد ہے۔ جہاں تک کلیات دین کا تعلق ہے اس میں صرف براہ راست استدلال ہی

قابل اعتبار ہے۔کلیاتِ دین (مثلاً خدا ایک ہے) کو براہ راست استدلال سے ثابت ہونا چاہیے۔ اگر وہ استنباطی استدلال سے ثابت ہوتو وہ ثابت ہی نہیں ہوا۔

میں نے کہا کہ آپ حضرات کے تمام استدلالات استنباطی ہیں۔مگر نصب العین جیسے معاملہ میں استنباطی استدلال معتبر نہیں۔مثلاً مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ''تفہیم القرآن'' میں ''اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ'' کی آیت کے تحت کئی صفحات لکھے ہیں۔مگر وہ سب کے سب استنباطی نوعیت سے تعلق رکھتے ہیں۔میں نے کہا کہ اگر آپ کو اس سے اتفاق نہ ہوتو مجھے کوئی ایک ایسی کتاب یا مضمون بتائیے جس میں اس معاملہ کو براہ راست استدلال سے ثابت کیا گیا ہو۔مگر وہ کسی ایسی کتاب یا مضمون کا حوالہ نہ دے سکے۔تعجب ہے کہ اس علمی افلاس کے باوجود لوگوں کا یقین برہم نہیں ہوتا۔

24 مارچ 1986

ممبئی سے شائع ہونے والے مرہٹی اخبار ''ترون بھارت'' میں شیوسینا کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے کا ایک بیان شائع ہوا ہے۔اس کا اردو ترجمہ پندرہ روزہ ''حالات'' (بھیونڈی) نظر سے گزرا۔

مسٹر بال ٹھاکرے نے کہا کہ مسلمان مطلقہ عورت کے معاملہ میں اسلامی شریعت کے قانون کا نفاذ چاہتے ہیں۔ہماری رائے ہے کہ ان پر ہر معاملہ میں اسلامی شریعت نافذ کر دی جائے۔پاکستان اور عرب ملکوں میں جرائم کے اوپر اسلامی سزائیں دی جاتی ہیں۔مسٹر بال ٹھاکرے نے مشورہ دیا کہ یہی ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے لیے کیا جائے۔انہوں نے کہا کہ حکومت کو چاہیے کہ شریعت کے مطابق وہ مسلمان چوروں کے ہاتھ کاٹ دے،مسلمان زانی کو سنگسار کرے اور مسلمان شرابی کو کوڑے مارے، وغیرہ۔مسلمانوں کے لیے اس قسم کے جرائم پر وہی سزا مقرر کی جائے جو ان کی شریعت میں مقرر ہے۔

مسٹر بال ٹھاکرے کی یہ بات تجویز نہیں بلکہ طنز ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ واقعتاً یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی شریعت نافذ کی جائے۔اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان مطلقہ عورت کو گزارہ نہ دینے کے لیے زبردست مطالبہ کر رہے ہیں اور اس کے لیے بہت بڑے

پیمانے پر متحد ہو گئے ہیں۔لیکن یہی مسلمان اس وقت بھاگ کھڑے ہوں گے جب یہ کہا جائے کہ آئندہ سے مسلم مجرمین کو شریعت کے مطابق کوڑا مارا جائے گا اور سنگسار کیا جائے گا اور ان کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔مسلمانوں کا موجودہ متحدہ مطالبہ صرف اس لیے ہے کہ خود ان کے اوپر اس کی زد نہیں پڑ رہی ہے لیکن اگر ان کو اپنی پیٹھ کے لیے بھی کوڑے کا خطرہ ہو اور ہاتھ کٹنے اور سنگسار کیے جانے کا اندیشہ ہو تو یہ متحدہ مطالبہ اچانک ختم ہو جائے گا۔

کیسے عجیب ہیں وہ مسلمان جنہوں نے اپنی نادان سیاست سے اسلام کو دوسروں کی نظر میں مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔

26 مارچ 1986

ڈاکٹر این۔جے۔خان (پیدائش 1932ء) انگلینڈ میں میڈیکل پریکٹس کرتے ہیں۔آج وہ ملاقات کے لیے آئے۔ان سے بہت سی دلچسپ اور مفید باتیں معلوم ہوئیں۔

انہوں نے بتایا کہ ان کے خاندان میں ان کے والد صاحب کے زمانہ سے خاندانی اجتماع کا نظام قائم ہے۔خاندان کے افراد وقفہ وقفہ سے ایک گھریلو اجتماع میں شریک ہوتے ہیں۔اس اجتماع کا صدر وہ شخص ہوتا ہے جو عمر میں سب سے زیادہ ہو۔

انہوں نے بتایا کہ ہمارے گھر میں کوئی جھگڑا نہیں۔ہمارے یہاں بھی خاندان کے ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان وقتی شکایتیں ہوتی ہیں مگر وہ بڑھنے سے پہلے ختم ہو جاتی ہیں۔کیوں کہ خاندانی اجتماع میں لوگ اپنی ہر بات کو کھلے طور پر بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد اجتماع کا صدر (گھر کا بڑا) جو فیصلہ کرتا ہے، اس کو سب لوگ بلا بحث مان لیتے ہیں۔

مزید سوالات کے بعد انہوں نے بتایا کہ اس نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا خاص راز ہے — ریزن کے سامنے سر جھکا دینا اور اپنی غلطی کو فوراً مان لینا۔

انہوں نے کہا کہ میں اس کو سب سے بڑا انسانی کیریکٹر سمجھتا ہوں۔مجھے ڈاکٹر خان صاحب کی یہ بات بہت پسند آئی۔حقیقت یہ ہے کہ اگر ہر خاندان میں اس قسم کا نظام قائم ہو جائے تو تمام

خاندانی جھگڑے اپنے آپ مٹ جائیں گے۔

ڈاکٹر خان صاحب کی شادی 1959ء میں ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میرے والد نے ایک روز 11 بجے رات کو مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہارا نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تم گھر کا چراغ چاہتے ہو یا شمع محفل۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں شمع محفل لے کر کیا کروں گا۔ مجھ کو تو گھر کا چراغ چاہیے۔ اس کے بعد ان کے والد صاحب نے اپنے انتخاب سے ایک خاتون کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ کاش یہی اسپرٹ ہمارے تمام نوجوانوں میں پیدا ہو جائے۔

27 مارچ 1986

آج دو صاحبان ملنے کے لیے آئے۔ دونوں وکیل ہیں اور دینی مزاج رکھتے ہیں۔ انہوں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی کتاب ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ یہ کتاب مولانا مودودی کے فکر کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ مگر عملاً وہ اس فکر کی تردید نہیں، بلکہ تصدیق بن گئی ہے۔ یہ کتاب ایک مضبوط کیس کی کمزور وکالت ہے۔

میں نے کہا کہ اس وقت عالم اسلام میں بنیادی طور پر دو قسم کے دینی فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک تبلیغی جماعت کا دینی فکر اور دوسرا ابوالاعلیٰ مودودی کا دینی فکر۔ جس میں، میں مولانا علی میاں کو بھی شامل سمجھتا ہوں۔ مولانا علی میاں کا فکر بدلے ہوئے الفاظ میں مولانا مودودی ہی کا فکر ہے۔

میں نے کہا کہ سوچنے کے دو طریقے ہیں — ایک انقلاب فرد اور دوسرا انقلاب نظام۔ تبلیغی فکر کے مطابق دینی دعوت کا اصل نشانہ یہ ہے کہ فرد کے اندر انقلاب پیدا کیا جائے گا۔ مودودی فکر کے مطابق دینی دعوت کا نشانہ یہ ہے کہ نظام کے اندر انقلاب لایا جائے۔

انقلابِ نظام کا فکر سراسر غیر دینی ہے۔ مگر بدقسمتی سے مولانا علی میاں کا فکر بھی بنیادی طور پر یہی ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو وہ یقینی طور پر غیر واضح ہے۔ دین کا اصل کام یہ ہے کہ فرد کے اندر فکر یا انقلاب پیدا کیا جائے۔ فرد کے اندر خدا پر یقین اور آخرت کی فکر پیدا کیا جائے۔ تبلیغی جماعت اصلاً یہی کام کر رہی ہے اور بلاشبہ یہی کرنے کا اصل کام ہے۔

انفارمل ایجوکیشن

موجودہ زمانے میں مختلف رہ نماؤں نے فارمل ایجوکیشن کے بڑے بڑے تعلیمی ادارے بنائے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ اِن اداروں میں ملّت کے نوجوانوں کو تربیت دے کر ایک ترقی یافتہ نسل بنا سکیں گے۔ مگر یہ تمام خواب منتشر ہو کر رہ گئے۔ کوئی بھی ادارہ مطلوب نئی نسل کو وجود میں لانے کا ذریعہ نہ بن سکا۔ ایسا صرف اِس لیے ہوا کہ یہ منصوبہ غیر فطری تھا، اور کوئی بھی غیر فطری منصوبہ اِس دنیا میں کبھی کامیاب ہونے والا نہیں۔

ایجوکیشن کی دو قسمیں ہیں، فارمل ایجوکیشن اور انفارمل ایجوکیشن۔ میرا تجربہ ہے کہ صرف فارمل تعلیم، علم کے حصول کے لیے کافی نہیں۔ خواہ وہ سیکولر تعلیم ہو یا دینی مدرسے کی تعلیم۔ جو فارمل تعلیم اداروں میں ہوتی ہے، اس میں آدمی کسی دوسرے کی بتائی ہوئی باتوں کا علم حاصل کرتا ہے۔ مگر علم کا خزانہ اس سے بہت زیادہ ہے، جتنا کہ کسی بتانے والے نے آپ کو بتایا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی فارمل ایجوکیشن کے بعد خود مطالعہ کرے۔ خود مطالعے سے آدمی، خود دریافت کردہ علم کو حاصل کرے گا۔ اور خود دریافت کردہ علم ہی سے آدمی کو حقیقی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے انسان مسائل پر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ معاملات کو گہرے انداز میں سمجھنا چاہتے ہیں۔ فکر و فہم ان کی غذا ہوتی ہے۔ وہ کسی بات کو اسی وقت مانتے ہیں جب کہ اس کو ان کی فکری سطح پر قابل فہم بنا دیا گیا ہو۔

الرسالہ مشن کی حیثیت انفارمل ایجوکیشن کی ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ فارمل ایجوکیشن پائے ہوئے لوگوں کو انفارمل ایجوکیشن مہیا کی جائے، تا کہ ان کے اندر آرٹ آف تھنکنگ پیدا ہو۔ دونوں طریقوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ دونوں تعلیمی طریقے ایک دوسرے کے لیے تکمیلی حصہ (complementary part) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں طریقوں کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً مدرسے کی تعلیم سے اگر دین کا روایتی علم حاصل ہوتا ہے تو انفارمل ایجوکیشن کے ذریعہ آدمی دور جدید سے واقفیت حاصل کرتا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ کسی انسان کے لیے دونوں ہی ضروری ہے۔

کیسا عجیب اسلام

ایک مسلم ملک کا واقعہ ہے۔ وہاں ''اسلامی انقلاب'' آیا۔ اس کے بعد اس ملک میں جو نئی تبدیلیاں آئیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں کے پبلک مقامات کی سیڑھیوں پر امریکا، روس اور اسرائیل کے جھنڈوں کی تصویریں بنائی گئیں، تاکہ لوگ ان کو روند کر عمارتوں میں داخل ہوں۔ (کوثر، بنگلور، رمضان 1404ھ)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کون سا دین ہے جس کو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے دریافت کیا ہے۔ وہ نفرت کا دین ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مفروضہ دشمنان اسلام کی انا (ego) کو ٹھیس پہنچائی جائے۔ اگر ابتدائی اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو رسول اللہ کا طریقہ اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے کسی صحابی کو کسی کام سے بھیجتے تو یہ نصیحت کرتے تھے: بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا، وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1732) یعنی، لوگوں کو بشارت دو، ان کو ناگواری میں نہ ڈالو، ان کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرو، سختی کا نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اسلام یہ تھا کہ انھوں نے لوگوں کی خیر خواہی میں ان کے لیے دعائیں کیں۔ وہ اس لیے تڑپے کہ لوگ ہدایت کو قبول کر کے اللہ کی جنت میں داخل ہوں۔ انھوں نے اپنے دشمنوں سے بھی محبت کا سلوک کیا تاکہ ان کا دل اسلام کے لیے نرم ہو۔ انھوں نے بگڑے ہوئے لوگوں کے ساتھ تالیف قلب کا معاملہ کیا تاکہ ان کی فطرت کو جگایا جاسکے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین نے ایک ایسا اسلام دریافت کر رکھا ہے جو انسانوں کو اسلام سے مزید دور کر دیتا ہے۔

آج کی دنیا میں اسلام کے نام پر دوسروں سے نفرت کرنے والے بہت ہیں مگر اسلام کے لیے دوسروں سے محبت کرنے والا کوئی نہیں۔ اسلام کے نام پر جھنڈا اٹھانے والے بے شمار ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں جو اسلام کے لیے اپنے جھنڈے کو نیچا کر لے۔ اسلام کے نام پر دوسروں سے لڑنے والے ہر طرف دکھائی دیتے ہیں مگر اسلام کے لیے صلح کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ اسلام کے نام پر بولنے والوں سے خدا کی زمین بھر گئی ہے مگر وہ انسان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا جو اسلام کی خاطر چپ ہو گیا ہو۔ اسلام کے نام پر لوگوں کو پیروں سے روندنے والے بہت ہیں مگر خدا کا وہ بندہ کہیں دکھائی نہیں دیتا جو اسلام کی خاطر لوگوں کو اپنے سینہ سے لگا لے۔

بے خبری کا مسئلہ

قدیم زمانے میں ملکی اعتبار سے کوئی مسلّمہ سرحدی حد بندی موجود نہ تھی۔ اس کی وجہ سے دنیا میں وہ کلچر رائج تھا، جس کو ایک قدیم فارسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ھَر کِہ شَمشیر زَنَد سِکّہ بَنامَش خَوانَندُ (جو شخص تلوار چلاتا ہے، اُسی کے نام کا دنیا میں سکہ چلتا ہے)۔ اس کلچر نے عملاً دنیا میں ایک قسم کی انارکی قائم کر رکھی تھی۔ دنیا میں مسلّمہ اصول کی بنیاد پر قائم شدہ سرحدیں موجود نہ تھیں۔ اس بنا پر قدیم دنیا میں کبھی کوئی بڑی ترقی نہ ہوسکی۔ کیوں کہ دنیا میں جغرافی استحکام (stabiliy) موجود نہ تھا، اور استحکام کے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔

پہلی جنگِ عظیم (1914-1918ء) کے بعد دنیا کے مدبرین نے اس مسئلے پر سوچنا شروع کیا۔ اس سوچ کا یہ نتیجہ نکلا کہ دنیا میں جغرافی حد بندی کا تصور رائج ہوا، جس کو مبنی بر وطن قومیت (Nation State) کہا جاتا ہے۔ اس اصول کو عملاً تمام ملکوں میں تسلیم کرلیا گیا۔ لیکن اس معاملے میں مسلم لیڈروں کا استثنا ہے، جو اس معاملے میں عدم وضوح کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ مثلاً جمال الدین افغانی، امیر شکیب ارسلان، محمد اقبال، اور سید ابوالاعلیٰ مودودی، وغیرہ۔ اس لیے وطنی قومیت کا تصور مسلمانوں میں ڈیولپ نہ ہوسکا۔

راقم الحروف کے نزدیک پہلی جنگ عظیم نے ایک جبر (compulsion) پیدا کیا۔ اس کی وجہ سے مبنی بر وطن قومیت کا تصور رائج ہوا۔ یہ بلاشبہ ایک جغرافی نعمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر اس زمانے میں مسلم لیڈروں میں اینٹی برٹش سوچ کا غلبہ تھا۔ اس منفی سوچ کی بنا پر مسلم لیڈر وطنی قومیت کے بارے میں بھی بروقت کوئی فیصلہ نہ لے سکے۔ اور مسلمانوں میں وطنی قومیت کا مسئلہ ایک ناپسندیدہ تصور کی حیثیت سے رائج ہوگیا۔ آج مسلمان اسی کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ ان کی قومی وفاداری آج کل ہر جگہ مشکوک سمجھی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں غالباً مولانا حسین احمد مدنی تھے، جنھوں نے کہا تھا کہ فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ لیکن ان کے شاگردوں نے ان کی وفات کے بعد یہ اعلان کرکے ان کی بات کو غیر موثر بنا دیا کہ حضرت نے یہ بات بطور خبر کہی تھی، بطور انشا نہیں۔

جغرافی حد بندی کے بعد ایک اور مسئلہ باقی تھا۔ وہ تھا، عالمی امن (world peace) کا مسلّمہ اصول۔ یہ مسئلہ دوسری جنگ عظیم کے ذریعے طے ہوا۔ دوسری جنگ عظیم (1939-1945ء) نے ہتھیار کا نیا تصور قائم کیا۔ وہ تھا ویپنز آف ماس ڈسٹرکشن (weapons of mass destruction)۔ یعنی دنیا میں جو ہتھیار رائج ہوئے، وہ عمومی تباہی کے ہتھیار تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ایسے ہتھیار بن گئے، جو دوطرفہ تباہی کرتے تھے۔ یعنی آپ دشمن کو ماریں، تو آپ خود بھی اس کا شکار ہوتے ہیں۔

اس صورتِ حال نے دوبارہ لوگوں کے اندر یہ سوچ پیدا کی کہ اب جنگ ایک ایسی چیز ہے، جس میں کسی فریق کو کوئی فائدہ نہیں۔ اس صورتِ حال نے یہ عالمی ذہن پیدا کیا کہ اب جنگ کا دور ختم ہو چکا ہے۔ کیوں کہ جنگ کسی کے لیے مفید نہیں ہے۔ برطانیہ کے سابق پرائم منسٹر چمبرلین (1869-1940ء) نے کہا تھا کہ جنگ میں کوئی بھی سائڈ اپنے آپ کو فاتح کہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ جنگ میں کوئی جیتنے والا نہیں ہے، تمام لوگ ہارنے والے ہیں:

In war, whichever side may call itself the victor, there are no winners, but all are losers.

سابق امریکی صدر لنڈن بی جانسن (1908-1973ء) نے اس سنگین حقیقت کو اس طرح بیان کیا تھا کہ جدید جنگ میں کوئی فاتح نہیں ہے، صرف بچ جانے والے ہیں:

In modern warfare there are no victors; there are only survivors.

اس طرح عالمی جنگ اول اور عالمی جنگ ثانی دونوں نے ایسا کمپلشن (compulsion) پیدا کیا، جس نے لوگوں کو اس اصول کو ماننے پر مجبور کیا کہ اب جنگ بند کرو۔ کیوں کہ جنگ میں کوئی جیتنے والا نہیں ہوگا۔ سب ہارنے والے ہوں گے۔ اس طرح پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں ٹریویل ڈکومنٹ کا اصول رائج ہوا۔ یعنی جس کے پاس پاسپورٹ اور ویزا ہو، اس کو کوئی روکنے والا نہیں۔ یہ دونوں اصول دعوت الی اللہ کے مشن کے لیے بے حد مفید تھے۔ اس اصول کے رواج نے پہلی بار دنیا میں عالمی دعوت کے امکان کو واقعہ بنایا۔ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے اس اصول کو اپنے انٹرسٹ کے لیے جانا، لیکن دعوت الی اللہ کے لیے اس کی اہمیت کو وہ نہ سمجھ سکے۔ یہ بلاشبہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی سب سے بڑی بے خبری ہے۔

گرین لینڈ، ایک وارننگ

اٹلانٹک اور آرکٹک کے درمیان واقع گرین لینڈ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اس کے نزدیک ترین ممالک کینیڈا اور آئس لینڈ ہیں۔ یہ جغرافی طور پر شمالی امریکہ کے براعظم کا حصہ ہے۔ تاہم، سیاسی لحاظ سے یہ جزیرہ ڈنمارک کا حصہ ہے۔ یہ دنیا میں برف پر مشتمل دنیا کی دوسری سب سے بڑی برفانی شیٹ بھی ہے۔ اس کے کل رقبے کا 81 فیصد برف کی چادروں سے ڈھکا ہوا ہے۔ مگر اب یہاں کی صورتِ حال تبدیل ہو رہی ہے۔ بی بی سی اردو کی ویب سائٹ پر چھپی ایک رپورٹ (26 جنوری 2019ء) کے مطابق، گذشتہ دو دہائیوں کے درمیان گرین لینڈ میں برف کی چادر میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی ہے۔ 2003ء سے 2013ء تک گرین لینڈ کی برفانی چادر میں چار گنا کمی واقع ہوئی ہے۔ 2004ء سے سن 2013ء کی دہائی میں یہ عمل مسلسل اور شدید تھا جس کی مثال پچھلے 350 برسوں میں کسی ایک دہائی میں نہیں ملتی ہے... تحقیق سے حاصل شدہ نتائج کے مطابق گرین لینڈ کا جنوب مغربی حصہ جو اب تک اس حوالے سے بڑا خطرہ تصور نہیں کیا جا رہا تھا اس کے بارے میں اب یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ مستقبل میں سمندر کی سطح بلند کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

کچھ دنوں پہلے ایک اور تشویشناک رپورٹ سامنے آئی ہے۔ گرین لینڈ میں برف کا پگھلنا نہ صرف اوپر سے جاری ہے، بلکہ اندرونی طور پر بھی یہ پگھلاؤ جاری ہے۔ نئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ گرین لینڈ کی برفانی پرتیں نیچے سے تیزی سے پگھل رہی ہیں اور وہاں پانی جمع ہونے سے پوری آئس شیٹ کا پگھلاؤ تیزی سے بڑھے گا اور اس سے عالمی سمندروں کی سطح مزید اونچی ہوگی۔ گرین لینڈ کی برفیلی چادروں کا مجموعی رقبہ 50 ہزار مربع کلومیٹر ہے لیکن ان کی گہرائی معلوم کرنا اب بھی ممکن نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کی ماڈلنگ اور نقشہ سازی نہیں کی گئی تھی۔

اب کیمبرج یونیورسٹی کے سائنسدانوں، پال کرسٹوفرسن اور ان کے ساتھیوں نے گرین لینڈ کی برف کی جڑوں کا پگھلاؤ معلوم کرنے کا ایک طریقہ ڈھونڈا ہے۔ انھوں نے لیزر کے ذریعہ اس

کی گہرائی اور کیفیت معلوم کی ہے۔ پال نے جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نیچے جو برف پگھل کر پانی بہہ رہا ہے وہ پرانے اندازہ سے بھی 100 گنا زائد ہے، اور اس کی رفتار براہِ راست دھوپ سے پگھلنے والی برف سے زیادہ تھی۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ اول، اوپر کا گرم پانی نیچے جمع ہو کر مزید برف پگھلا رہا ہے۔ دوم، قوت کشش سے بھی برف گھل رہی ہے۔ اس تحقیق سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ جہاں جہاں آئس لینڈ جیسی برفانی پرتیں ہیں وہاں بھی برف پگھلنے کی رفتار اتنی ہی تیز ہو سکتی ہے۔ (urlty.co/mJTW)

مولانا وحید الدین خاں صاحب گلوبل وارمنگ کے تعلق سے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: ''یہ صورت حال زمین کے اوپر ہر قسم کی زندگیوں کے لیے سنگین خطرہ ہوگی۔ کوئی بھی انسانی تدبیر ان کا مقابلہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ بالواسطہ یا براہِ راست طور پر اس کا اثر تمام انسانی آبادیوں تک پہنچ جائے گا۔ حالات بتاتے ہیں کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے، جب کہ موجودہ دنیا کا خاتمہ ہو جائے۔'' (الرسالہ، مئی 2008)، اور وہ دن آجائے جب کہ تمام لوگ اپنی زندگی کا حساب دینے کے لیے، قرآن کے الفاظ میں، خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے (83:6)۔

اس لیے یہ وقت کا تقاضا ہے کہ انسان اس دن کے آنے سے پہلے اپنے لیے ضروری تیاری کر لے تاکہ وہاں کسی قسم کی ناکامی کا سامنا نہ پیش آئے۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب لکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں صدی عیسوی میں کہا تھا کہ میرے اور قیامت کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہے جتنا فاصلہ انسان کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6505)۔ گلوبل وارمنگ کا ظاہرہ بتاتا ہے کہ یہ فاصلہ اب ختم ہو چکا ہے۔ جدید سائنس جس موسمیاتی تبدیلی (clamatic change) کی خبر دے رہی ہے، وہ تبدیلی سائنس دانوں کے بیان کے مطابق، اب اِس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب اس کو دوبارہ الٹی طرف لوٹانا ممکن نہیں۔ اب آخری وقت آ گیا ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو بدلے۔ حالات کی یہ خاموش پکار ہے کہ انسان اپنے آپ کو درست کر لے، اِس سے پہلے کہ اپنے آپ کو درست کرنے کا موقع اس کے لیے باقی نہ رہے (دیکھیے: الرسالہ جولائی 2008)۔ ڈاکٹر فریدہ خانم، نئی دہلی

استطاعت کا اصول

قرآن وحدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جو احکام ہیں، وہ سب کے سب ''استطاعت'' پر مبنی ہیں۔ یعنی خدا کے دین میں عمل بقدر استطاعت کا اصول ہے۔ استطاعت سے زیادہ کا مکلف بنانا اللہ کا طریقہ نہیں (البقرہ، 2:286 ؛ التغابن، 64:16)۔ یہ اصول فرد (individual) کے لیے بھی ہے، اور سوسائٹی کے لیے بھی۔

فقہاء کا اتفاق ہے کہ دینی عمل کی ادائیگی کی شرط استطاعت ہے (اتفق الفقهاء على أن الاستطاعة شرط للتكليف)۔ لہٰذا جو انسان کسی عمل کو انجام دینے کی استطاعت نہیں رکھتا اس کے اوپر اس عمل کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اصول قرآن وسنت کے بہت سارے نصوص سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن (2:286) میں اللہ تعالی کا فرمان ہے: اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق (الموسوعة الفقهية الكويتية، جلد 3، صفحہ 330)۔

استطاعت کا مطلب ہے — کسی خاص عمل کی انجام دہی کے لیے انسان میں جسمانی یا ذہنی کام کو کرنے کی صلاحیت یا قوت یا طاقت کا موجود ہونا:

An aptitude or ability for a particular activity, capacity or power to do a physical or mental thing.

مسلم علما کے نزدیک استطاعت کا مطلب ہے کہ انسان کسی چیز کو جان یا مال کے ذریعے سے کرنے پر قادر ہو۔ یہ حالت بدلتی رہتی ہے، لوگوں کے حالات کے بدلنے سے، اور نتائج کے بدلنے سے (المستطيعُ هو القادِرُ في مالِه وبَدَنِه، وذلك يختلِفُ باختلافِ أحوالِ النَّاسِ، واختلافِ عوائِدِهم) الموسوعة الفقهية للسقاف، جلد 2، صفحہ 44۔

''عمل بقدر استطاعت'' کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ زندگی کا یہی واحد فطری اصول ہے۔ انسان جب دنیا میں کوئی عمل کرنا چاہتا ہے تو یہ ہمیشہ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہوتا ہے۔ انسان اتنا ہی کرسکتا ہے، جتنا خارجی حالات اس سے موافقت کریں۔ خارجی حالات کی موافقت کے بغیر انسان کوئی کام نہیں کرسکتا۔

اسی طرح فرد اور اجتماع کا معاملہ بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ جہاں تک فرد کا تعلق ہے، اس کے ذاتی معاملات پر اس کو پورا اختیار ہوتا ہے۔ ایک فرد کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے لیے جس چیز کو درست سمجھے، اس کو مکمل طور پر اختیار کرے۔ مثلاً اپنی حیثیت کے مطابق عادل بننا ہر آدمی کے اپنے اختیار کی چیز ہے۔ اس کے برعکس، سماجی سطح پر عدل کا نظام قائم کرنا پورے سماج کا معاملہ ہے۔ پہلی چیز فرد کے ذاتی اختیار پر منحصر ہے، اور دوسری چیز سماج کے مجموعی اختیار پر۔

ایک شخص کی ذمہ داری صرف اسی قدر ہے جو اس کے بس میں ہو۔ جو چیز اس کے بس میں نہ ہو، اس کی ذمہ داری بھی اس پر نہیں۔ انسان کسی عمل کے وقت جتنی استطاعت رکھے گا، خدا کے نزدیک اتنا ہی وہ اس عمل کا مکلف ہوگا۔ مثلاً عام حالات میں وضو کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہے، مگر آدمی جب بیمار ہو یا وہ ایسی جگہ پر ہو جہاں پانی نہ ملے تو وہ تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔

اجتماع کا معاملہ فرد کے برعکس ہے۔ اجتماعی یا سماجی معاملہ ہمیشہ کئی لوگوں کے درمیان ہوتا ہے۔ سماج کے معاملے میں وہی طریقہ چل سکتا ہے، جس پر سب کا اتفاق ہو۔ اس کے برعکس کوئی طریقہ اگر خارجی طور پر کسی کی طرف سے سماج کے اوپر نافذ کیا جائے تو لازماً لوگوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہو جائے گا۔ ایسے موقع پر سماج کے اندر پہلے اختلاف آئے گا، پھر ٹکراؤ آئے گا، پھر نفرتیں بڑھیں گی، اور پھر آخر میں تشدد (violence) کی نوبت آجائے گی۔ گویا مطلوب چیز تو حاصل نہ ہوگی، البتہ اس کا برعکس نتیجہ فساد کی صورت میں سامنے آجائے گا۔ یہ حقیقت ایک حدیث رسول میں اِس طرح بتائی گئی ہے: مِنْ حُسْنِ إِسْلامِ الْمَرْءِ، تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 1737)۔ یعنی آدمی کا حسنِ اسلام یہ ہے کہ وہ اُس عمل کو ترک کر دے جو بے نتیجہ ثابت ہونے والا ہو۔

اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ فرد اور اجتماع دونوں کے تقاضے کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ فرد کے لیے اس کے ذاتی دائرہ میں معیار کا اصول ہو، اور اجتماع کے لیے استطاعت (قابلِ عمل) کا اصول۔ اس فارمولے کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

Idealism at the individual level, pragmatism at the social level.

استطاعت کے اصول کو آج کی زبان میں نتیجہ رخی عمل (result-oriented action) کہا جا سکتا ہے۔ (مولانا فرہاد احمد)

خبرنامہ اسلامی مرکز—280

1۔ 29-30 اپریل 2023 کو نئی دہلی کے ہوٹل دی لیلا امبینس میں سی پی ایس انٹرنیشنل نئی دہلی کے زیر اہتمام پیس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ تمام سی پی ایس ممبران اسلام کی پرامن تعلیم کو دنیا کے ہر حصے میں پہنچائیں۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب کے بعد سی پی ایس انٹرنیشنل کی یہ پہلی کانفرنس تھی۔ اس میں الرسالہ مشن کے تحت کام کرنے والے نیشنل اور انٹرنیشنل چیپٹرز کے داعیوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ حصہ لیا، اور کانفرنس کے بعد ایک نئی انرجی کے ساتھ واپس ہوئے۔ تمام لوگوں نے یہ عہد کیا کہ وہ مولانا صاحب کے بعد امن اور اسپریچولٹی کے اس مشن کو نئی اسپرٹ کے ساتھ آگے بڑھائیں گے۔ کانفرنس کی کارگزاریوں کو جاننے کے لیے سی پی ایس انٹرنیشنل کے آفیشل یوٹیوب اور فیس بک پیج کو وزٹ کیا جا سکتا ہے۔

2۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب کے ذریعہ دنیا کے بے شمار لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی آئی ہے۔ ذیل میں ایسے کچھ تاثرات نقل کیے جا رہے ہیں:

- 2015ء سے میں نے مولانا وحید الدین خاں کو سننا شروع کیا، ان کی ہفتہ وار کلاسوں کو جوائن کیا۔ کیوں کہ مولانا کی کلاس مجھے سب سے منفرد نظر آئی۔ مولانا کا مشن ایک الگ مشن تھا۔ آج کے دور میں ہر کوئی اپنے آپ کو درست ثابت کرنے میں لگا ہوا ہے لیکن مولانا نے ہمیں یہ سکھایا کہ سب سے بہتر انسان وہ ہے جو اپنی غلطی کو مانے۔ مولانا ایک انقلابی اور ایک روحانی انسان تھے۔ آپ نے خدا شناسی اور تزکیہ نفس پر بہت زور دیا۔ یہ بتایا کہ موت کے بعد کی زندگی اور اللہ تعالی سے ملاقات کا شوق ہمیں معرفت سے قریب کرتا ہے۔ ہم لوگ اندھیروں میں تھے۔ یہ کہہ لیجیے کہ فضول کاموں میں مصروف تھے۔ لیکن مولانا سے جڑنے کے بعد ہمیں حقیقی معنوں میں خدا کی پہچان کا موقع ملا۔ مولانا نے ہمیشہ انسان کو غور وفکر کا حکم دیا اور کائناتی نشانیوں کے ذریعہ خدا کو سمجھنے اور اس کو تلاش کرنے کے بارے میں بتایا۔ مولانا کی آواز ایک منفرد آواز تھی جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی، مولانا کا کام ہمیشہ انسان کو غور وفکر کی طرف لے جاتا رہے گا۔ (سید محمد حسیب شاہ نقوی، سرگودھا)

- It was the month of Ramadan 2019, I was a first year student. I watched one of Maulana Wahiduddin Khan's videos on Facebook. This gave me a kind of inner inspiration and peace. Since then I am following and supporting the work of Maulana Wahiduddin Khan. Maulana Wahiduddin Khan was a mentor for me as well as for the world. He has taught me the real meaning of life. Through his books and videos, I have learnt many things, such as spiritual development, the art of life management, peace, right way of thinking, modesty and patience. He has rendered a great service in the form of Islamic literature. May Almighty Allah rest his soul in peace and grant us the strength to follow him and be a part of his Dawah mission. (Sami Khan, Quetta, 21st April, 2023)

3۔ کتاب ''اسباق تاریخ'' پر تبصرہ: مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتاب ''اسباق تاریخ'' اُن متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو ماہ نامہ الرسالہ میں چھپتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں بیان کردہ تاریخی واقعات مختلف زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا کی اس تصنیف کا مقصد تاریخ سے عبرت اور نصیحت حاصل کرنا ہے۔ عموماً ہم تاریخ کا مطالعہ جذبۂ فخر کی تسکین کے لیے کرتے ہیں۔ جب کہ ایام گزشتہ کا مطالعہ عبرت پذیری اور سبق آموزی کے لیے ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں تاریخی واقعات سبق آموزی کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے تاریخ سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ انداز فکر زندگی کی تعمیر کا موثر ترین ذریعہ ہے۔

آغاز اسلام سے لے کر آج تک اسلامی تاریخ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں جنگوں کے واقعات اور کامیابیوں کی داستانیں ہیں۔ جب کہ اسلام کی تاریخ صرف کشور کشائی تک محدود نہیں ہے۔ اسلام کی تاریخ حقیقی معنوں میں انسانی فکر کے انقلاب کی تاریخ ہے۔ اسلام نے اپنی گزشتہ پندرہ صدیوں میں کروڑوں انسانوں کی زندگیاں بدلیں، زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب برپا کیا۔ ایسی ہمہ گیر تبدیلی شمشیر وسنان سے واقع نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ تبدیلیاں فرد فرد پر فکری محنت کرکے ہی حاصل ہوسکتی ہیں۔ مگر زیادہ تر مورخین نے جنگ وفتوحات کا ذکر کیا ہے۔ جب کہ اسلام کی اصل طاقت اس کی تلوار نہیں، بلکہ اس کا امن ومحبت کا پیغام ہے۔ اسلامی تعلیمات نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ عدل کے پرچم کو بلند کیا۔ انسانیت کو محترم ٹھہرایا۔ خالق ومخلوق کے تعلق کو واضح کیا۔ لیکن جنگ وفتوحات کے ذکر میں یہ مثبت تعلیمات ثانوی درجہ میں چلی گئیں۔ مولانا وحید الدین خاں نے مذکورہ کتاب میں اسلامی تاریخ کو درست زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ قاری کو وسیع النظر بناتا ہے اور وہ تاریخ سے جذبۂ فخر حاصل کرنے کے بجائے دانش کشید کرتا ہے۔ موجودہ ملکی اور سماجی حالات میں اس کتاب کا مطالعہ بہت سودمند ہے۔ (محمد فاروق، لاہور)

اعلان

سی پی ایس انٹرنیشنل، نئی دہلی کی جانب سے ہندستان کے دینی مدارس اور دیگر ملی وتعلیمی اداروں کو مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابیں ہدیے میں بھیجی جارہی ہیں۔ اس مقصد کے تحت ادارہ کی جانب سے مسٹر آصف خان مدارس میں جاتے ہیں، اور وہاں کی انتظامیہ سے اجازت حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان مدارس کو کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔ قارئین الرسالہ اور دوسرے خواہش مند حضرات سے گزارش ہے کہ وہ آصف صاحب سے مندرجہ ذیل نمبر پر رابطہ قائم کرکے اس سلسلے میں ان کا تعاون فرمائیں۔ شکریہ:

رابطہ نمبر: +91-99185785630

भविष्यवाणी योग्य चरित्र

क़ुरआन में पसंदीदा बन्दों की विशेषता यह बताई गई है कि वे अपने वादे को पूरा करने वाले लोग हैं, कि वे किसी से वादा कर लें तो उसे ज़रूर पूरा करते हैं. यह बिल्कुल वही नैतिक गुण है, जिसको हमने भविष्यवाणी के योग्य चरित्र (predictable character) कहा है.

जिस तरह लोहे के ऊपर किसी छत को खड़ा किया जाए तो पहले से यह यकीन होता है कि वह छत के बोझ को संभाल लेगा. इसी तरह जब एक इन्सान दूसरे इन्सान से कोई वादा करे तो पहले से यह विश्वास होना चाहिए कि वह ज़रूर उस वादे को पूरा करेगा, वह किसी हाल में भी उससे नहीं हटेगा.

इसी बात को एक हदीस में इस तरह बयान किया गया है कि मुनाफ़िक़ (कपटी झूठा, पाखंडी) आदमी की तीन निशानियां हैं— जब वह बात करे तो झूठ बोले, जब वह वादा करे तो उससे फिर जाए जब उसको अमानत सौंपी जाए तो वह अमानत में खयानत करे.

उपरोक्त तीनों बातें भविष्यवाणी के योग्य चरित्र के ख़िलाफ़ हैं. जब किसी इन्सान से बात की जाती है तो इस विश्वास पर की जाती है कि वह सही बात कहेगा, वह झूठ और ग़लत बयानी से काम नहीं लेगा. अब अगर वह सत्य के विपरीत बोलने लगे तो उसने पूर्वानुमान के विरुद्ध कार्य किया. इसी तरह जब किसी से वचन लिया जाता है तो इस विश्वास पर लिया जाता है कि वह इस वचन पर अडिग रहेगा. अब अगर आदमी अपने वचन से फिर जाए या उसके विरुद्ध काम करने लगे तो उसने अपने बारे में पूर्वानुमान को पूरा नहीं किया. इसी तरह जब कोई अमानत (धरोहर) किसी को सौंपी जाती है तो इसी भरोसे पर सौंपी जाती है कि वह वक़्त पर इसे पूरी तरह लौटा देगा. अब अगर वह समय पर अमानत उसके हक़दार को न लौटाए तो इसका मतलब यह है कि वह भविष्यवाणी के योग्य (या विश्वसनीय) चरित्र का आदमी नहीं है.

क़ायनात अपने भविष्यवाणी के योग्य चरित्र के कारण कामिल (सही प्रामाणिक और सम्पूर्ण) है. इसी तरह इन्सान भी उसी हालत में 'कामिल' हो सकता है जब वह भविष्यवाणी के योग्य चरित्र वाला बन जाए.

एक आज़माइश

क़ुरआन में बताया गया है कि अल्लाह ने किसी के सीने में दो दिल नहीं बनाए। (अल-अहज़ाब 4) इससे इन्सान की एक पैदाइशी कमज़ोरी मालूम होती है। वह कमज़ोरी यह है कि इन्सान एक वक़्त में दो चीज़ों पर ध्यान नहीं दे सकता। आदमी सिर्फ़ एक चीज़ को अपने ध्यान का केन्द्र बना सकता है। जब भी वह एक चीज़ पर फोकस ध्यान केन्द्र) करेगा तो दूसरी चीज़ें निश्चित रूप से उसके फोकस से बाहर (out of focus) हो जाएंगी।

इन्सान का यह गुण इन्सान के लिए एक बेहद नाजुक आज़माइश है। अपने हालात या अपनी रूचि के लिहाज़ से वह एक चीज़ को अपनाता है। 'एक दिल' वाले स्वभाव की वजह से उसे एक चीज़ सारी चीज़ नज़र आने लगती हैं। बाकी चीज़ें बाहरी तौर पर मौजूद होते हुए भी उसके लिए गैर-मौजूद हो जाती हैं। वह अपनी इस सोच में दृढ़ होता रहता है, यहां तक कि उसी एक चीज़ को वह सब से बड़ी चीज़ समझ लेता है, जिस पर शुरू में उसने अपनी नज़रों को जमाया था।

यह नाजुक और गंभीर स्थिति है, जिसमें हर इन्सान फंसा हुआ है। अपने प्राकृतिक स्वभाव की वजह से चूंकि दूसरी चीज़ें आदमी के फ़ोकस में नहीं होतीं इसलिए बाक़ी चीज़ों की हैसियत उसके लिए ऐसी हो जाती है जैसे उनकी कोई अहमियत नहीं, बल्कि शायद उनका कोई अस्तित्व ही नहीं।

इन्सान की इसी पैदायशी बनावट की वजह से इन्सान के अन्दर वह कमज़ोरी पैदा होती है, जिसके बारे में क़ुरआन में कहा गया है कि शैतान ने लोगों के लिए उनके कामों को उनकी नज़र में खूबसूरत बना दिया है (अन्-नहल 23)। इसी तरह क़ुरआन में है कि लोग नापसंदीदा काम में व्यस्त होते हैं और समझते

हैं कि वे बहुत अच्छा काम कर रहे हैं (अल-कहफ़ 104)। दूसरी वजह है कि लोग दीन को टुकड़े-टुकड़े कर देते हैं और फिर अपने आप उसके एक हिस्से को लेकर खुश होते हैं कि वे असली दीन को पकड़े हुए हैं (अर-रूम 32)।

किसी इन्सान के लिए इस तरह की तबाहकुन स्थिति क्यों आती है? इसका कारण उसका यही स्वभाव है। वह जब एक बार किसी चीज़ को अपना लेता है तो इसके बाद ऐसा होता है कि उस एक चीज़ के अलावा दूसरी तमाम चीज़ें अपने आप उसके लिए ओझल (आउट ऑफ फ़ोकस) हो जाती हैं। वह मौजूद होते हुए भी उसके अपने लिए ऐसी बन जाती हैं जैसे कि वे मौजूद ही न हों।

अब आदमी की सारी दिलचस्पी उसकी अपनी अपनाई हुई चीज़ से हो जाती है। अपने विशिष्ट प्रनोविज्ञान के कारण वह इस बनावटी विश्वास में पड़ जाता है कि वह मामले का सिरा पकड़े हुए है। हालांकि उसके हाथ में सिर्फ़ एक ऐसा बेक़ीमत तिनका होता है, जो तूफ़ान के पहले ही झटके में उससे अलग हो जाए।

इसी लिए क़ुरआन में कहा गया है कि हर इन्सान अपने ढंग (तरीके) पर अमल करता है और अल्लाह ही बेहतर जानता है कि कौन शख्स ज़्यादा सही रास्ते पर है (बनी इसराईल 84)। इस आयत से यह बात मालूम होती है कि ऐसा हो सकता है कि एक शख़्स अपने निजी तौर-तरीक़े में अपने आपको पूरी तरह सच्चा समझे पर वह अल्लाह की नज़र में सच्चा न हो। ऐसे लोग आख़िरत में बेक़ीमत हो कर रह जाएंगे।

इन्सान की यह पैदायशी कमज़ोरी जिस तरह आम इन्सान के लिए घातक है उसी तरह वह मुस्लिम समाज के लोगों के लिए भी 'फ़ित्ना' है। इस आम आज़माइश के मामले में मुसलमान अपवाद नहीं। मुसलमानों के बीच भी ऐसा हो सकता है कि कुछ लोग दीन के एक पहलू को लेकर उसको अपने ध्यान का केन्द्र बना लें और फिर दीन के दूसरे तमाम तक़ाज़े उनके फ़ोकस से बाहर निकल जाएं। ऐसे लोगों का सारा ध्यान बस एक चीज़ पर जम कर रह जाएगा।

क़ुरआन और हदीस के मापदंड के मुताबिक वह अपने बनाए हुए दीन पर होंगे, पर अपने निजी ज़ेहन के लिहाज़ से वह यही समझेंगे कि वे सच्चाई पर हैं,

क्योंकि उनका ज़ेहन उन्हें बता रहा होगा कि उन्होंने दीन के सबसे अहम हिस्से को पकड़ रखा है।

यह एक बेहद नाजुक आज़माइश है, जिसमें हर आदमी फंसा हुआ है। यही वह स्थिति है, जिसके बारे में क़ुरआन हरेक को चेतावनी दे रहा है- कहो, क्या मैं तुमको आगाह करूं कि अपने कर्मों के लिहाज़ से सबसे ज़्यादा घाटे में कौन हैं। वे लोग जिनकी कोशिश दुनिया की ज़िन्दगी में अकारथ हो गई। और वे समझते रहे कि वे बहुत अच्छा काम कर रहे हैं। (अल-कहफ़)।

इस इम्तिहान से बचने का एकमात्र ज़रिआ अपने आपको जांचना (आत्मविश्लेषण) है। यानी अपने स्वभाव को कसौटी न समझना, बल्कि क़ुरआन और सुन्नत को दीन की कसौटी बना कर अपने आपको उस पर जांचते रहना।

एक आयत

रज़ीन ने ज़ैद बिन असलम से रिवायत किया है। वह कहते हैं कि दूसरे ख़लीफ़ा हज़रत उमर बिन खत्ताब रज़ियल्लाहु अन्हु ने एक रोज़ पानी मांगा। उनके पास एक प्याले में पानी लाया गया, जिसमें शहद मिला हुआ था। हज़रत उमर ने कहा कि यह अच्छा है। मगर मुझे क़ुरआन की आयत (अल-अहकाफ़ 20) याद आती है जिसमें बताया गया है कि क़ियामत में कुछ लोगों से कहा जाएगा कि तुम अपनी अच्छी चीज़ें दुनिया में ले चुके। अब आख़िरत की अच्छी चीज़ों में तुम्हारा कोई हिस्सा नहीं। मुझे डर है कि यह वही न हो। हज़रत उमर ने कहा और प्याला पिए बग़ैर वापस कर दिया।

ऊपर वाली आयत के तहत अक्सर 'तफ़्सीरों में इस तरह के वाक़ियात दर्ज होते हैं। इससे कुछ लोगों ने यह असर ले लिया गोया दुनिया की अच्छी चीज़ों को इस्तेमाल करने का यक़ीनी मतलब है आख़िरत की अच्छी चीज़ों से वंचित हो जाना। मगर यह सही नहीं। हज़रत उमर का एक ख़ास मौके पर शहद का

शर्बत न पीना महज़ शिद्दते-तास्सुर (तीव्र प्रभावशीलता) की वजह से था वह 'शरई हुक्म' के तौर पर न था, बल्कि तक़वा (संयम) के एहसास के तहत था।

हदीस में आया है कि कोई बन्दा उस वक़्त तक 'मुत्तक़ी' (संयमी) के दर्जे तक नहीं पहुंच सकता, जब तक उसका यह हाल न हो जाए कि वह (कभी कभी ऐसी चीज़ों को भी छोड़ दे, जिसमें हर्ज नहीं है, इस अन्देशे की वजह से कि शायद इसमें हर्ज हो।

हज़रत उमर के उस मामले को भी इसी हदीस के तहत देखना चाहिए। अगर दुनिया की अच्छी चीज़ों को ज़रूरी तौर पर क़ाबिले तर्क समझा जाए तो यह नज़रिया क़ुरआन की उन आयतों से टकरा जाएगा, जिनमें अच्छी और पाक चीज़ों को साफ़ तौर पर ईमान वालों के लिए जायज़ बताया गया है। यहां तक कि कहा गया है कि कहो, अल्लाह की 'ज़ीनत' (शोभा) को किसने हराम ठहराया है, जो उसने अपने बन्दों के लिए पैदा की हैं और खाने की तय्यब (पाक) चीज़ें। कहो कि वे दुनिया की ज़िन्दगी में भी ईमान वालों के लिए हैं और आख़िरत में तो वे ख़ास उन्हीं के लिए होंगी (अल-आराफ़ 32)।

मानवीय गुण

क़ुरआन में मामूली लफ़्ज़ी फ़र्क के साथ दो जगहों पर यह बात कही गई है कि अल्लाह किसी क़ौम की हालत को उस वक़्त तक नहीं बदलता जब तक कि वह उसको न बदल डाले जो उसके जी में है (अर रअद)।

इस ख़ुदाई सुन्नत से मालूम होता है कि किसी गिरोह के क़ौमी और इज्तिमाई हालात उसके वैयक्तिक हालात पर निर्भर हैं। इसको दूसरे लफ़्ज़ों में इस तरह कहा जा सकता है कि क़ौमी हैसियत का दारोमदार मानवीय गुणों पर है। किसी क़ौम के लोगों में इन्सानी या अख़्लाक़ी या नैतिक ख़ूबियां जैसी होंगी, उसी के मुताबिक उसको दुनिया में सामूहिक मुक़ाम हासिल होगा, न उससे कम और न उससे ज़्यादा।

इस मामले को समझने के लिए मौजूदा ज़माने की एक मिसाल लीजिए। यह बात सभी लोग मानते हैं कि जापान ने दूसरे विश्व युद्ध के बाद बहुत ग़ैरमामूली तरक्की की है। इस तरक्क़ी का एक खास राज़ उनकी एकता है। जापानी हर काम को एकजुट होकर करते हैं। एकता को आखिरी वक़्त तक बरकरार रखते हैं। इसकी वजह से उनकी ताक़त बहुत बढ़ जाती है। वे हर मामले में ग़ैरमामूली तौर पर कामयाब रहते हैं।

जापान की इस एकता का राज़ वहां के लोगों का वैयक्तिक स्वभाव है, जो तक़रीबन तमाम जापानियों के अन्दर पाया जाता है। प्रोफ़ेसर ची नकानी (Chie Nakane) की जापानी भाषा में एक किताब है, जिसका तर्जुमा अंग्रेजी में जापानी समाज (Japanese Society) के नाम से छपा है। इस किताब में जापानी प्रोफ़ेसर ने लिखा है कि जापानी का वैयक्तिक मिज़ाज यह होता है कि वह समझता है कि मैं किसी के मातहत हूं

I am under someone.

दूसरे लफ़्ज़ों में यह कि हर जापानी अधीनता-भाव में जीता है। इसलिए जब भी कोई सामूहिकता कायम होती है तो वह फ़ौरन उससे जुड़ जाता है। वह तन्ज़ीम यानी संगठन के नेता को फ़ौरन अपना नेता मान लेता है, क्योंकि वह पहले ही से यह माने हुए था कि मैं किसी के मातहत हूं — यह है जापानियों की उस एकता का राज़ जिसके नतीजे में उन्होंने मौजूदा ज़माने में अप्रत्याशित तरक्की की है।

अब मौजूदा ज़माने के मुसलमानों को देखिए। मुसलमानों का मामला जापानियों के बिल्कुल बरअक्स है। मसजिद से लेकर सियासत तक कोई मामला ऐसा नहीं, जिसमें मुसलमान मुत्तहिद या एक हों। मौजूदा मुसलमान दुनिया की सबसे ज़्यादा बरबाद क़ौम हैं, और इसकी सबसे बड़ी वजह बेशक उनमें इत्तिहाद और एकता का न होना है। इस 'बेइत्तिहादी' ने एक अरब इन्सानों की महान् क़ौम को दुनिया की सबसे कमज़ोर क़ौम बना दिया है।

मौजूदा मुसलमानों की इस 'बेइत्तिहादी' का सबब क्या है? इसका सबब, दोबारा, उनके लोगों का वह ग़लत मिज़ाज है जो किसी भी इत्तिहाद की राह में एक स्थायी रुकावट बन गया है।

मौजूदा ज़माने में जब मुसलमान पस्ती, मग़लूबियत और पतन का शिकार हुए तो उनके रहनुमाओं की तश्ख़ीस (मर्ज़ की जांच) यह थी कि पश्चिम के प्रभाव में आ जाने से उनको पस्ती से दो-चार किया। इसलिए तमाम रहनुमाओं ने एक या दूसरी सूरत में यह किया कि इस्लाम को गर्वपूर्ण अन्दाज़ में पेश करना शुरू कर में दिया, ताकि उनके प्रभुत्व को ख़त्म कर सकें। इसका नतीजा यह है कि मुसलमानों की पूरी नस्ल गर्व और हाकिमियत (शासकत्व) के एहसास पर परवरिश पा कर उठी है। हर आदमी नज़रिए और आस्था के लिहाज़ से अपने अन्दर बरतरी और बढ़प्पन का जज़्बा लिए हुए है। क्योंकि यही जज़्बा उसके अन्दर उभारा गया था।

यह मानसिकता एकता की क़ातिल है। एकता उस वक़्त क़ायम होती है जबकि एक शख़्स को बड़ा बना कर बाक़ी तमाम लोग उसके मुक़ाबले में छोटे बनने पर राज़ी हो जाएं। मगर मुसलमानों की गर्व की मानसिकता इसमें रुकावट है। इसका नतीजा यह है कि अब हर आदमी सरदार बनना चाहता है। हर आदमी चाहता है कि उसकी बात चले। हर आदमी चाहता है कि हाकिमाना सीट पर बैठे। ऐसी हालत में एकता कायम होना मुमकिन नहीं। और मुसलमानों की यही वह मानसिकता है, जिसने आज उनके दरमयान किसी भी एकता को सरासर नामुमकिन बना दिया है।

मौजूदा ज़माने के मुसलमानों का अस्ल मसला सत्ता को खोना नहीं, बल्कि इन्सानी गुणों को खोना है। मौजूदा मुसलमान अपने रहनुमाओं और लीडरों की ग़लत रहनुमाई के नतीजे में ऊंचे मानवीय गुणों से खाली हो गए हैं। अब सबसे पहला ज़रूरी काम यह है कि मुसलमानों के अन्दर वे गुण पैदा किए जाएं जो आला इन्सानियत का निर्माण करते हैं। जब तक यह काम नहीं किया जाएगा मुसलमानों के हालात तब्दील नहीं हो सकते। कोई दूसरी कोशिश चाहे वह

कितने ही बड़े पैमाने पर की जाए, मुसलमानों के लिए किसी नए भविष्य का निर्माण नहीं कर सकती।

अनोखी विशेषता

क़ुरआन में बहुत विस्तार के साथ जन्नत का ज़िक्र किया गया है। उन सबका खुलासा इस संक्षिप्त आयत में है कि जन्नत में वह तमाम चीज़ें होंगी जिनको आदमी का जी चाहेगा और जिनसे उसकी आंखों को लज़्ज़त हासिल होगी (अज़्-जुखफ़ 71)।

इन्सान तमाम मालूम सृष्टि में एक अनोखी सृष्टि है, जो लज़्ज़त (आनंद) चाहता है जो लज़्ज़त का बोध कर सकता है। इस अजीब इन्सान के लिए अल्लाह तआला ने यह बेहद अजीब संभावना रखी है कि उसके लिए श्रेष्ठतम लज़्ज़तों से भरी हुई एक जन्नत बना दी, जहां वह हमेशा-हमेशा रह सके।

लज़्ज़त (pleasure) की सृष्टि बेशक सृजनहार का एक हैरतनाक रचनात्मक करिश्मा है। एक इंजीनियर ख़ुदा की दी हुई अक़्ल और ख़ुदा की दी हुई चीज़ों को काम में लाकर मशीनी इन्सान (रोबोट) बनाता है। वह सारे इन्सानी काम करता है। पर किसी मशीनी इन्सान के अन्दर आनन्द बोध नहीं। कोई मशीन किसी भी चीज़ से आनंदित होना नहीं जानती। यह सिर्फ़ इन्सान है जो आनन्द और लज़्ज़त का बोध करता है, जो अपनी पसंदीदा चीज़ों से आनंदित हो सकता है।

आनन्द या लज़्ज़त कोई सीमित चीज़ नहीं। यह एक निहायत व्यापक बल्कि असीमित अर्थ रखने वाला शब्द है। इन्सान सिर्फ़ खाने-पीने जैसी लज़्ज़तों ही से आनंदित नहीं होता, बल्कि हर स्तरीय चीज़ में उसके लिए लज़्ज़त है। मसलन एक कम्प्यूटर सौ हज़ार सवालों का निहायत सही जवाब देगा। मगर वह अपने काम पर खुश होना नहीं जानता। पर इन्सान जब एक सूक्ष्म काम करता है, जब वह एक मसले का निहायत उम्दा जवाब देता है तो उसकी रूह

को बेपनाह खुशी हासिल होती है। यही बात दूसरे तमाम कामों के बारे में लागू होती है।

जन्नत में हर चीज़ अपने चरम स्तर पर होगी। जन्नत में जो आदमी दाख़िल किया जाएगा वह भी चरम स्तरीय शख़्सियत में ढाल कर दाखिल किया जाएगा। इसलिए जन्नत का हर काम असीमित आनन्द देने वाला बन जाएगा। वहां बोलना, छूना, देखना, सुनना, उठना, बैठना और चलना-फिरना हर क्रिया अपने अन्दर अनन्त, असीमित आनंन्द से भरी होगी।

क़ुरआन और साइंस

1984 के आखिर में एक ख़बर कई अख़बारों में छपी। कनाडा के अख़बार सिटीज़न (22 नवम्बर 1984) ने उसकी सुर्ख़ी इस तरह लगाई: प्राचीन पवित्र किताब अपने वक़्त से सौ साल आगे।

नई दिल्ली के अख़बार टाइम्स ऑफ इंडिया में (10 दिसम्बर 1984) यह ख़बर इस सुर्ख़ी के साथ छपी:

क़ुरआन आधुनिक साइंस पर बाज़ी ले जाता है।

भ्रूण विज्ञान के एक विद्वान जिनका ताल्लुक़ कनाडा की टोरोंटो यूनिवर्सिटी से है, उन्होंने सऊदी अरब के कई सफर किए हैं, ताकि क़ुरआन की कुछ आयतों की व्याख्या करने में मदद करें। ये आयतें वे हैं जिनमें मानव-भ्रूण के विकास का ज़िक्र है।

यह डाक्टर कैथमूर हैं। इनकी खोजों से, जो टेस्ट ट्यूब बेबी की ईजाद करने वाले डाक्टर राबर्ट एडवर्ड्स से सम्बद्धता रखती हैं, ज़ाहिर होता है कि क़ुरआन की सम्बद्ध आयतें इन्सानी भ्रूण के क्रमिक विकास का निहायत सही बयान हैं। यह चीज़ वह है, जिसका ज़िक्र पश्चिमी विशेषज्ञों ने पहली बार 1940 में किया था और इस सिलसिले की ज़्यादातर तफ़सीलात सिर्फ़ पिछले पन्द्रह वर्षों में अमली तौर पर साबित की जा सकी हैं। डाक्टर मूर ने

लिखा है कि 13 सौ साल पुराने क़ुरआन में भ्रूण विकास के बारे में इस क़दर दुरुस्त बयान मौजूद है कि मुसलमान यक़ीन कर सकते हैं कि वह ख़ुदा की तरफ़ से उतारी हुई किताब है।

यह सात वर्ष पहले की बात है, टोरांटो यूनिवर्सिटी के एक भ्रूण-वैज्ञानिक एक ग़ैरमामूली वैज्ञानिक अभियान पर सऊदी अरब गए। उनसे क़ुरआन की कुछ आयतों की व्याख्या में मदद चाही गई थी। यह डाक्टर कैथ मूर थे। पहली टेस्ट ट्यूब बेबी के आविष्कारक डा. एडवर्ड ने भी उनकी व्याख्याओं की पुष्टि कर दी थी। उन दिनों वैज्ञानिकों ने मुस्लिम 'उल्मा' को क़ुरआनी आयतों के बारे में अपनी खोज से हैरान कर दिया था। वही क़ुरआन जिसको मुसलमान तेरह सौ वर्ष से 'हिफ़्ज़' व 'तिलावत' करते चले आ रहे हैं।

जो उन्होंने खोज की थी वह यह थी कि क़ुरआन में मानव भ्रूण का जो नज़रिया बयान किया गया है वह अब एक निर्विवाद सच्चाई बन कर सामने आया है। और यह कि पश्चिमी खोजकर्ताओं को यह हक़ीक़त 1940 में पता चली और इस सिलसिले में ज़्यादातर मालूमात तो महज़ पिछले पन्द्रह वर्ष में सामने आई हैं। डाक्टर कीथ मूर टोरोंटो यूनिवर्सिटी के एम्ब्रियोलॉजी विभाग के चैयरमेन हैं। इन्सान की तख़्लीक़ और सृजन से ताल्लुक़ रखने वाली कुरआनी आयतों पर अपना ख़ास पेपर पेश करते हुए उन्होंने कहा:

> "मुझे इस बात ने हैरत में डाल दिया, जब मुझे यह पता चला कि क़ुरआन ने सातवीं सदी ईस्वी में जो तथ्य पेश किए वे किस क़दर दुरुस्त और वैज्ञानिक सच्चाइयों से पूर्ण हैं और उनमें कितनी वैज्ञानिक सटीकता है।"

मुसलमानों की आस्था है कि क़ुरआन सातवीं सदी ईस्वी में ख़ुदा की तरफ़ से अपने पैग़म्बर हज़रत मुहम्मद सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम पर उतारा गया। उसके बाद उन्होंने इस्लाम दुनिया के सामने पेश किया। आज इस्लाम ईसाईयत के बाद दूसरा बड़ा मज़हब है। याद रहे कि डाक्टर मूर यूनाइटेड चर्च के मेम्बर और एक बड़े पादरी के बेटे हैं। वह अपनी आस्था पर संतुष्ट हैं और एक

मुलाकात में बता चुके हैं कि इस्लाम कबूल करने का उनका कोई इरादा नहीं। डा. मूर कहते हैं कि मैंने बाइबिल के ओल्ड टेस्टामेंट और न्यू टेस्टामेंट का अध्ययन भी किया है, लेकिन कुरआनी आयतों से उनकी कोई समानता नज़र नहीं आई। भ्रूण विज्ञान पर उनकी दो किताबें हैं। और दुनिया की भाषाओं में उनके अनुवाद छप चुके हैं। डाक्टर मूर कहते हैं कि भ्रूण के शुरुआती 28 दिनों में विकास के बारे में कुरआनी आयतों ने जो के तथ्य बयान किए हैं वे इतने सही हैं कि इन्सानी अक़्ल को ताज्जुब में डाल देते हैं। डा. मूर को यक़ीन है: क़ुरआन की आयतें और पैग़म्बरे इस्लाम के कुछ कथन मज़हब और साइंस के बीच मुद्दतों की खाई को पाटने में मदद कर सकते हैं।

जब उनसे पूछा गया कि कहीं ऐसा तो नहीं कि कहीं अधकचरी चीर-फाड़ के नतीजे में यह मालूमात सामने आ गई हों, तो उन्होंने कहा कि इस चरण में भ्रूण का आकार एक मिली लीटर के दसवें हिस्से से ज़्यादा नहीं होता। यह इन्सानी आंख को एक छोटे से नुक्ते की शक्ल में नज़र आता है। इसकी शिनाख्त एक ताक़तवर सूक्ष्मदर्शी के बग़ैर मुमकिन नहीं और यह बात अपनी जगह साबित है कि सत्तरहवीं सदी ईस्वी से पहले सूक्ष्मदर्शी ईजाद नहीं हुई थी।

डाक्टर मूर ने जब अपनी तहक़ीक़ पेश की, उससे दो वर्ष पहले उन्हें जद्दा की शाह अब्दुल अज़ीज़ यूनिवर्सिटी ने बुलाया था। उनके अलावा डाक्टर राबर्ट एडवर्ड्स को भी बुलाया था। यह वही डाक्टर राबर्ट हैं, जिनके कैम्ब्रिज यूनिर्सिटी में किए गए प्रयोग की बदौलत पहले टेस्ट ट्यूब बच्चे की पैदाइश अमल में आई।

उनके अलावा डाक्टर टी.वी.एन. प्रसाद और डाक्टर मार्शल जान्सन भी आमंत्रित किए गए। डाक्टर मूर कहते हैं कि इस मौके पर होने वाली कान्फ्रेंस के उल्मा ने इन चारों विशेषज्ञों को क़ुरआन की बहुत सी आयतों के अंग्रेज़ी तर्जुमे पेश किए और उनसे राय मांगी कि क्या इनकी कोई वैज्ञानिक व्याख्या हो सकती है? एक आयत जो पेश की गई वह यह थी:

"वह तुम्हें तुम्हारी मांओं के पेटों में तीन-तीन अंधेरे पदों के अन्दर तुम्हें एक के बाद एक शक्ल देता चला जाता है।" (अल-ज़ुमर)

डा. मूर कहते हैं कि इन तीन अंधरों के बारे में साफ़ तौर पर कहा जा सकता है कि इनसे तात्पर्य पेट की दीवार, गर्भाशय का पर्दा और बच्चेदानी की अन्दरूनी झिल्ली है। एक दूसरी आयत में बताया गया है कि बाद में बूंद को खून के लोथड़े (मुज़ग़ा) में तब्दील कर दिया जाता है। अरबी में मुज़ग़ा का लफ़्ज़ जोंक के लिए आया है। डा. मूर और दूसरे विशेषज्ञों का ख़याल है कि अरब में पाई जाने वाली जोंक और 24 दिन के भ्रूण में हैरतअंगेज़ तौर पर समरूपता पाई जाती है। फिर यह कि इस चरण पर भ्रूण गर्भाशय की दीवार से जौंक की तरह लिपट जाता है।

आगे की एक आयत कहती है कि यह जोंकनुमा लोथड़ा बाद में चबाई हुई चीज़ की शक्ल इख़्तियार कर लेता है। इस चरण में भ्रूण की शक्ल को समझाने के लिए डा. मूर ने प्लास्टिक की एक छोटी-सी चीज़ तैयार की और फिर उसे अपने दांतों से चबाया और फिर उसे दिखाते हुए कहा कि 28 दिन के भ्रूण की शक्ल हूबहू ऐसी होती है और उस पर जो निशान पाए जाते हैं वे भी दांतों के निशानों जैसे होते हैं। इस आयत से यह भी मालूम होता है कि इस अवस्था में जिस्म के चंद ही अंगों की शनाख्त हो सकती है और हक़ीक़त भी यही है कि सिर्फ दिल और आंखों की पहचान मुमकिन होती है।

डा. मूर ने कहा कि क़ुरआन की आयतें कहती हैं कि तेज़ी से निकलने वाले वीर्य के एक बेहद छोटे हिस्से में जनन क्षमता रखने वाले शुक्राणु पाए जाते हैं। डा. मूर ने बताया कि जिस हक़ीक़त को स्पैलिनज़ैनी ने अठारहवीं सदी ईस्वी में पहचाना, जब उसने प्रयोगात्मक तरीके से साबित किया कि जब तक नर और मादा के प्रजनन तत्वों का आपसी मेल न हो तो जैवीय अस्तित्व प्रकट नहीं हो सकता। क़ुरआन ने इससे ग्यारह सदियों पहले 'मख़्लूत क़तरे' के बारे में बताया और कहा कि मर्द और औरत के 'नुत्फ़ों' के आपसी मिलाप से इन्सान की सृष्टि होती है।

पैग़म्बर का तरीक़ा

इमाम मुस्लिम अपनी सहीह में कहते हैं कि मुझसे इब्ने अबी उमर ने कहा, उन से मर्वान फ़ज़ारी ने बयान किया, उनसे यज़ीद बिन कयसान ने, उनसे इब्ने अबी हाज़िम ने और उन से अबू हुरैरा ने कहा कि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम से कहा गया कि आप मुश्रिकों के ख़िलाफ़ बद्दुआ करें। आपने फ़रमाया कि मुझको ला'नत करने वाला बना कर नहीं भेजा गया है, बल्कि मुझको रहमत बना कर भेजा गया है।

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम पर और आपके सहाबियों और साथियों पर उनके दुश्मनों ने जो मुसीबतें डालीं और ज़ुल्म किया वह आज के ज़ुल्म और मुसीबत से बहुत ज़्यादा था। यहां तक कि मुक़द्दस सहाबा इन जुल्मों को देख कर कह उठे कि उनके ख़िलाफ़ बद्दुआ की जाए। मगर रसूलुल्लह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने उनके ज़ेहन को सही किया। उन्होंने फ़रमाया कि हमारा काम दुनिया को ख़ुदा की रहमतों के साये में दाख़िल करना है न कि उनकी हलाकत और बरबादी का सामान करना।

यह रसूलुल्लह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम की सुन्नत है। आपके ख़िलाफ़ लोगों ने ज़ुल्म किया, इसके बावजूद आपने उनके साथ ख़ैरख़्वाही की। लोगों ने आपके ऊपर मुसीबतें डालीं, इसके बावजूद आप उनके लिए अल्लाह तआला से दुआ करते रहे। रसूलुल्लह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के इसी आला और बेहतर सुलूक का नतीजा था कि आपको दुनिया में आलातरीन कामयाबी हासिल हुई। क़ौमें आपके आगे झुक गईं। ज़ुल्म और सरकशी करने वाले आपके हाथ पर बैअत करके यानी आपसे दीक्षा लेकर आपके साथी और सहयोगी बन गए।

मुलसमानों को भी अपने पैग़म्बर के इसी नमूने पर अमल करना है। हमको दुनिया की क़ौमों का ख़ैरख़्वाह और उनकी भलाई चाहने वाला बनना है, चाहे वे हमारे साथ बदख़्वाही और बुराई करें।

हमें लोगों के हक़ में हिदायत की दुआ करना है, चाहे वे हमारे साथ ज़ुल्म और ज़्यादती का मामला करें। हमें दूसरे से मुहब्बत करना है, चाहे हमें दूसरों की तरफ़ से नफ़रत, घृणा और वैर मिले।

यही पैग़म्बर का तरीक़ा है। और पैग़म्बर का तरीक़ा इख़्तियार करने के बाद ही मुसलमान ख़ुदा की उन नुसरतों और मदद के हक़दार बन सकते हैं जिनका वा'दा ख़ुदा ने अपने पैग़म्बर के ज़रिए उनके लिए किया है।

अल्लाह की मदद

पैग़म्बरे इस्लाम सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के ज़माने में और उसके बाद मुसलमानों को जो ग़ैरमामूली फत्हें हासिल हुईं; उनकी वजहें बताते हुए इतिहासकारों ने बहुत कुछ लिखा है। *इन्सायक्लोपीडिया ब्रिटैनिका* (1984) में है:

> At least three aspects of the contemporary situation of Byzantium and Persia account for the phenomenal ease with which the Arabs overcame their enemies; first, both empires, exhausted by wars, had demobilized before 632. (vol. 3. p. 557)

उस ज़माने की कुछ बेज़ैन्तीनी और ईरानी शहन्शाहियत के कम से कम तीन पहलू हैं, जो यह बताते हैं कि उनके ऊपर अरबों को इतनी आसानी से इतनी बड़ी कामयाबियां कैसे हासिल हुईं। उनमें से पहली वजह तो यह है कि दोनों शहन्शाहियतें आपस की जंग के नतीजे में इतनी बरबाद हो गई थीं कि वे 632 ई. से पहले ही फौजी एतिबार से ख़त्म हो चुकी थीं।

तारीख़ के लिहाज़ से इस बात में बहुत कम (आंशिक) सच्चाई है। क्योंकि यह हक़ीकत है कि दोनों शहन्शाहियतों ने ग़ैरमामूली फौजी ताक़त से मुसलमानों का मुक़ाबला किया। फिर भी यह सच है कि मुसलमानों के साथ मुक़ाबला

होने से ठीक पहले दोनों शहन्शाहियतों में लम्बी खूनी जंग होना, इस्लाम के हक़ में सीधी ख़ुदाई मदद था। मौजूदा दुनिया में ख़ुदा की मदद अस्बाब के पर्दे में आती है। और रोम और ईरान की आपसी जंग की सूरत में अल्लाह तआला ने इस्लाम के दुश्मनों को इतना कमज़ोर कर दिया कि वे इस्लाम के लिए कोई ताक़तवर ख़तरा न बन सकें।

आज भी ख़ुदा की यह मदद ज़ाहिर हो सकती है, बशर्ते मुसलमान अपने अमल से उसका वही इस्तेहक़ाक़ (उपादेयता, पात्रता) साबित कर सकें जो पहले दौर के मुसलमानों ने अपने अमल से साबित किया था।

अल्लाह की मदद की बेशुमार सूरतें हैं। यह अल्लाह ही को मालूम है कि वह किस सूरत में किसके लिए अपनी मदद भेजेगा। फिर भी यह यक़ीनी है कि जो लोग अल्लाह पर सच्चा ईमान लाएं और उसकी मर्जी पर चलें, उनके हक़ में अल्लाह की मदद ज़रूर आती है, चाहे वह एक सूरत में आए या दूसरी सूरत में।

कम पर राज़ी होना

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम मदीना में थे। आपने ख़्वाब देखा कि अपने सहाबियों के साथ मक्का में दाखिल हुए। आपने वहां तवाफ़ (प्रिक्रमा) और सअइ किया। क़ुर्बानी और सर मुंडाया। आपने अपना ख़्वाब सहाबियों को बताया तो वे बहुत ख़ुश हुए। उन्होंने समझा कि यह अल्लाह की तरफ़ से उमरा की बशारत (ख़ुशख़बरी) है।

आप और आपके सहाबी मक्का से 9 मील फ़ासिले हुदैबिया पंहुचे थे कि क़ुरैश ने आगे बढ़ कर आपको रोक दिया। और कहा कि हम आप लोगों को मक्का में दाख़िल होने नहीं देंगे। इसके बाद दोनों के दरमियान बातचीत शुरू हुई। आख़िकार यह तय हुआ कि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम सहाबियों के साथ मदीना वापस चले जाएं। अलबत्ता अगले साल ख़ामोशी के साथ आकर उमरा कर सकते हैं।

इस समझौते के मुताबिक़ आपने फ़ैसला किया कि उमरा न करें और हुदैबिया से वापस होकर मदीना चले जाएं। फिर भी क़ुर्बानी के जानवर आपके साथ मौजूद थे। आपने फ़रमाया कि हम तवाफ़ और सअइ नहीं कर सके फिर भी क़ुर्बानी और हल्क़ हम कर सकते हैं। उठो अपने जानवरों को ज़ब्ह करो और सर बाल मुंडा लो।

यह गोया कम पर राज़ी होना था। हांलाकि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के ख़्वाब की बिना पर लोगों को पूरा यक़ीन हो गया था कि मक्का में दाख़िल होंगे। तवाफ़ और सअइ करेंगे। और फिर क़ुर्बानी और हल्क़ करेंगे। मगर जब ऐसे हालात सामने आए कि तवाफ़ और सअइ बज़ाहिर नामुमकिन हो गया और सिर्फ़ क़ुर्बानी और हल्क़ मुमकिन रह गया तो उन्होंने मक्का में दाख़िल होने और तवाफ़ और सअइ करने का इरादा छोड़ दिया और क़ुर्बानी और हल्क़ पर राज़ी हो गए।

यही ज़िन्दगी का राज़ है। इस दुनिया में आदमी को कम पर राज़ी होना पड़ता है, उसके बाद वह ज़्यादा को पाता है। जो शख़्स पहले मरहले में कम पर राज़ी न हो वह न कम पाता और न ज़्यादा को। उसके हिस्से में जो चीज़ आती है वह सिर्फ़ यह कि वह निज़ाअ और झगड़े को छेड़ कर ग़ैर ज़रूरी तौर पर अपने को बरबाद करता है। और जब बरबाद होकर टकराव के क़ाबिल न रहे तो यह कह कर अपने दिल को तस्कीन देने की कोशिश करे कि मैं कामयाबी के बिल्कुल क़रीब पहुंच गया था, मगर दुश्मनों की साज़िश ने मुझको नाकाम बना दिया।

कम पर राज़ी होना भी रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम की सुन्नतों में से एक सुन्नत है।

ख़ादिम की कोताहियों पर उसे माफ़ करना

अब्दुल्लाह विन उमर कहते हैं कि एक देहाती रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के पास आया और आपसे पूछा, "ऐ ख़ुदा के रसूल, मैं अपने ख़ादिम (सेवक) को कितनी बार माफ़ करूं?" आपने फ़रमायाः सत्तर बार माफ़ करो (*तिरमिज़ी, अबूदाऊद*)

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23